معلومات قرآن

(سوالات و جوابات)

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نام کتاب.. معلومات قرآن (سوالات و جوابات)

جوابات از .... علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ .... خانم شازیہ غضنفر

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "معلوماتِ قرآن" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہو گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

قرآن مجید کے سوروں کی ابتدا میں حروف مقطعات۔

قرآن مجید کے کئی سوروں کی ابتدا میں الم کے مانند حروف (مقطعات) ہیں کہ مفسرین ان کے معنی تک کو نہیں جانتے ہیں۔ جو کتاب تمام زمانوں کے لئے انسان کی راہنما ہے، اس میں کیوں مرموز الفاظ ہیں؟ یہ الفاظ آج کے انسان کی زندگی کی کن مشکلات کو حل کر سکتے ہیں۔ خداوند متعال کو بیہودہ کلام نہیں کرنا چاہئے۔

مختصر جواب

قرآن مجید کے حروف مقطعات کے بارے میں کافی بحثیں کی گئی ہیں، من جملہ علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

حروف مقطعات والے سوروں میں موجود شباہتوں کے پیش نظر ممکن ہے انسان احتمال دے کہ ان حروف اوران سے شروع ہونے والے سوروں کے درمیان کوئی رابطہ ہو۔

پس یہ حروف خداوند متعال اور اس کے پیغمبر (ص) کے درمیان ایسے رموز ہیں جن کے معنی ہم سے پوشیدہ ہیں اور ہمارا عادی فہم و ادراک ان کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ مگر یہ کہ ہم احتمال دیں کہ ان حروف اوران کے (سوروں کے درمیان کوئی) خاص رابطہ ہے۔

عصر جدید کے ایک محقق نے، قرآن مجید کے بعض سوروں کی ابتدا میں موجود حروف مقطعات کے بارے میں الیکٹرانک سسٹم سے ایک تحقیق کر کے کچھ اہم نکات ثابت کئے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآن مجید کے ۲۹ سوروں کی ابتدا میں پائے جانے والے

حروف مقطعات جو مفرد یا مرکب صورت میں ہیں، کی تعداد ان سوروں میں موجود دوسرے حروف سے زیادہ ہے۔

اس بنا پر حسب ذیل چند اہم نکات حاصل ہوتے ہیں:

الف) یہ حروف، جنہیں قرآن مجید کی اصطلاح میں حروف مقطعات کہتے ہیں بیہودہ نہیں ہیں۔

ب) یہ حروف خداوند متعال اور اس کے رسول (ص) کے درمیان ایک راز ہے کہ دوسروں کا اس راز کے بارے میں آگاہ نہ ہونا، ان کے بیہودہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

ج) اگر عام لوگوں کی ہدایت کے لئے لکھی گئی ایک کتاب میں کچھ کلیدی نکات خاص افراد کے لئے بھی موجود ہوں تو یہ اس کتاب کے ہدایت کرنے والی ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اگر چہ یہ رموز شاید براہ راست آج کے انسانوں کی کسی مشکل کو حل نہیں کر سکتے ہیں لیکن ممکن ہے پیغمبر (ص) ان رموز سے بہرہ مند ہوکر امت کی بہتر صورت میں راہنمائی کر سکیں اور اس طرح لوگوں کی کچھ مشکلات کو حل کر سکیں۔

ان سب مطالب کے باوجود حروف مقطعات جیسے مسائل کی بحث، دین کی داخلی بحث ہے، یعنی ہمیں اس موضوع پر اس وقت بحث کرنی چاہئے کہ جب ہم خدا اور نبوت وغیرہ کی بحث سے فارغ ہو چکے ہوں، اس لحاظ سے جب ہم نے خداوند متعال کو نیک اوصاف اور حکمت کے ساتھ پہچان لیا اور معلوم ہوا کہ خداوند متعال کوئی عبث و بیہودہ کام انجام نہیں دیتا ہے، تو اگر حروف مقطعات کے استعمال کا جیسا کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے کہ بالفرض ہم اس کی دلیل و راز کو معلوم نہ کر سکے تو بھی ہم اس کے اجمالی جواب (خدا کے حکیم ہونے) کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ کام بیہودہ نہیں ہے۔

تفصیلی جوابات

اس سوال کا ایک مناسب جواب دینے سے پہلے ہم قرآن مجید کے حروف مقطعات کے بارے میں پیش کئے گئے دو نظریات بیان کرتے ہیں:

قرآن مجید کے حروف مقطعات کے بارے میں کافی بحث کی گئی ہے،[1] جن مفسرین نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے، ہم ان میں سے پہلے علامہ طبا طبائی کا نظریہ پیش کریں گے پھر دوسرے مفسرین کے نظریات بیان کریں گے اور اس کے بعد نتیجہ نکالیں گے۔

علامہ طبا طبائیؒ فرماتے ہیں: قرآن مجید کے ۲۹ سوروں کی ابتدا میں حروف مقطعات آئے ہیں کہ ان میں سے بعض سورے ایک حروف سے شروع ہوتے ہیں، جیسے: سورہ ص، ق اور ن ۔بعض سورے دو حروف سے شروع ہوئے ہیں جیسے: طہ، طس، یس اور حم اور بعض سورے تین حروف سے شروع ہوتے ہیں، جیسے: الم، الر اور طسم اور بعض سورے چار حروف سے شروع ہوئے ہیں، جیسے: المص اور المر اور بعض سورے پانچ حروف سے شروع ہوئے ہیں، جیسے: سورہ کھیعص اور حمعسق۔

اس کے علاوہ یہ حروف (استعمال ہونے کی تعداد کے لحاظ سے) آپس میں فرق رکھتے ہیں ۔ ان میں سے بعض صرف ایک جگہ پر استعمال ہوئے ہیں، جیسے: ن اور ان میں سے بعض حروف کئی سوروں کی ابتدا میں آئے ہیں، جیسے: الم، الر، طس اور حم۔

اگر ہم ان دو نکات کو مد نظر رکھتے ہوئے، الم اور المر جیسے حروف مقطعات سے شروع ہونے والے سوروں پر ذرا غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ یہ سورے مضمون کے لحاظ سے بھی آپس میں شباہت رکھتے ہیں اور ان کا سیاق بھی یکساں ہے، اس طرح کہ ان کے درمیان پائی جانی والی شباہت دوسرے سوروں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

ایسے سوروں کی ابتدائی آیات میں جو شباہت پائی جاتی ہے، ان میں اس معنی کی تاکید کی گئی ہے کہ، مثال کے طور پر حم سے شروع ہونے والے سوروں کی پہلی آیت تلک آیات الکتاب کی عبارت سے شروع ہوتی ہے، یا ایک دوسری عبارت سے جس کے یہی معنی ہیں، اس قسم کی آیات ان سوروں کی ابتدا میں ہیں جو الر سے شروع ہوتے ہیں، جن میں فرما یا گیا ہے تلک آیات الکتاب یا اس معنی کی کوئی عبارت ہوتی ہے اس کی مثال ان سوروں میں ملتی ہے جو طس سے شروع ہوتے ہیں یا وہ سورے جو الم سے شروع ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر سوروں میں اس کتاب میں شک و شبہ نہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور ایک ایسی عبارت ہے جس کے یہی معنی ہیں۔

ان شباہتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ممکن ہے انسان خیال کرے کہ ان حروف اور ان حروف سے شروع ہونے والے سوروں کے مضامین میں کوئی خاص رابطہ ہوگا۔ اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ اعراف، جو المص سے شروع ہوا ہے، میں ایسے مطالب ہیں جو سورہ الم اور سورہ ص میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ رعد جو حروف المر سے شروع ہوا ہے، میں سورہ الم اور سورہ المر دونوں کے مطالب پائے جاتے ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف خداوند متعال اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان کچھ رموز ہیں، کہ ان کے معنی ہم سے پنہاں ہیں اور ہمارا عام فہم و ادراک انہیں سمجھنے سے قاصر ہے، مگر اسی حد تک کہ احتمال دیں کہ ان حروف اور ان حروف سے شروع ہونے والے مضامین کے درمیان کوئی خاص رابطہ ہے۔[2]

ان مطالب کو بیان کرنے کے سلسلہ میں عصر جدید کے ایک مفسر نے ایک دلچسپ نکتہ بیان کیا ہے، جس کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں: کئی سال قبل امریکہ میں مقیم

ایک مصری محقق ڈاکٹر رشاد کو قرآن مجید کے بعض سوروں کی ابتدا میں موجود حروف مقطعات کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں، جنھیں انہوں نے الیکٹرانیک سسٹم سے ثابت کیا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہر سورہ کی ابتدا میں پائے جانے والے ان حروف مقطعات کا اس سورہ کی آیات کے اندر پائے جانے والے دوسرے حروف کے ساتھ ایک رابطہ ہے، اس کے بعد اس نے اپنے اس انکشاف اور نظریہ کو کئی برسوں کی کوششوں کے نتیجہ میں الیکٹرانیک سسٹم کے ذریعہ ثابت کیا اور اس نتیجہ کا اعلان کیا کہ ان مفرد یا مرکب حروف مقطعات کی مقدار، ان سوروں میں موجود دوسرے حروف سے زیادہ ہے، اس انکشاف کی بنا پر، معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی مخصوص لغت، جملوں اور آیات کی غیر معمولی ترکیب کے معجزہ کے علاوہ اس کے حروف بھی ایک تنظیم اور حساب و کتاب کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں کہ وہ بذات خود ان کے معنی، حقائق ومحتوی کے علاوہ ایک معجزہ ہیں۔

یہ انکشاف قرآن مجید کے سورہ بقرہ کی ابتدا میں موجود حروف مقطعات کے بارے میں بعض پیش کئے گئے نظریات کو ثابت کرتا ہے کہ ان میں سے ایک ان مفرد یا مرکب حروف اور اس سورہ کے کلمات کے درمیان پائے جانے والے تناسب کے معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔ شائد یہ نظریات اور انکشافات مزید حقائق کشف ہونے کا ایک پیش خیمہ ہوں گے۔[3]

مذکورہ مطالب کے پیش نظر مندرجہ ذیل چند اہم نکات معلوم ہوتے ہیں:

الف) یہ حروف، جن کو قرآن مجید کی اصطلاح میں حروف مقطعات کہتے ہیں بیہودہ نہیں ہیں، کیونکہ ان کے بہت سے فوائد بیان کئے گئے ہیں اور اگر آپ اپنے ہی قول پر غور کریں گے، اور آپ نے ان حروف کو مرموز حروف سے تعبیر کیا ہے، اور ہم یہ گمان نہیں کرتے کہ اگر کوئی آپ سے لفظ مرموز کے معنی پوچھ لے، تو آپ جواب میں بیہودہ کہیں گے۔

ب) جو کچھ ہم نے اس سلسلہ میں مفسرین کے نظریات کے طور پر پیش کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف مقطعات، خداوند متعال اور اس کے پیغمبر (ص) کے درمیان ایک رمز (code) ہے البتہ ممکن ہے انسان اس کے بعض رموز کا انکشاف کر سکے اور ہر رمز میں کچھ اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں جن سے دوسرے بے خبر ہوتے ہیں اور دوسروں کا ان اسرار کے بارے میں باخبر نہ ہونا ان کے بیہودہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

ج) اگر عام لوگوں کے لئے لکھی گئی ہدایت پر مبنی کسی کتاب میں چند کلیدی نکتے خواص کے لئے بھی درج کئے گئے ہوں، تو اس کتاب کے ہدایت گر ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اگر چہ یہ رموز شاید براہ راست آج کے انسانوں کی کسی مشکل کو حل نہیں کر سکتے ہیں لیکن ممکن ہے پیغمبر (ص) ان رموز سے بہرہ مند ہو کر امت کی بہتر صورت میں راہنمائی کر سکیں اور اس طرح لوگوں کی کچھ مشکلات کو حل کر سکیں۔

ان سب مطالب کے باوجود حروف مقطعات جیسے مسائل کی بحث، دین کی داخلی بحث ہے، یعنی ہمیں اس موضوع پر اس وقت بحث کرنی چاہئے جب ہم خدا اور نبوت وغیرہ کی بحث سے فارغ ہو چکے ہوں، اس لحاظ سے جب ہم نے خداوند متعال کو نیک اوصاف اور حکمت کے ساتھ پہچان لیا اور معلوم ہوا کہ خداوند متعال کوئی عبث و بیہودہ کام انجام نہیں دیتا ہے، [4] تو اگر حروف مقطعات کے استعمال کا جیسا کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے کہ (بالفرض ہم اس کی دلیل و راز کو معلوم نہ کر سکے تو بھی ہم اس کے اجمالی جواب (خدا کے حکیم ہونے) کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ کام بیہودہ نہیں ہے۔

حواشی

[1] اس سلسلہ میں ہماری اسی سائٹ کے عنوان سے: معنای حروف مقطعات قرآن سوال: ۲۴۷۳ ملاحظہ

ہو۔

[2] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 18، ص 7، 8، ناشر: دفتر انتشارات اسلامی جامعۃ مدرسین حوزہ علمیہ قم، قم، طبع پنجم، 1374 ہ ش.

[3] طالقانی، سید محمود، پرتوی از قرآن، ج 5، ص 8، پاورقی، ج 4، ص 157، ناشر: شرکت سہامی انتشار، تہران، 1362 ھ ش.

[4] مؤمنون، 115.

قرآن مجید کی قرائت کے باطنی آداب سے کیا مراد ہے؟

مختصر جواب

چونکہ قرآن مجید، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لافانی معجزہ اور خداوند متعال کا کلام ہے، اس لئے صدر اسلام سے مسلمانوں کے درمیان خاص احترام و قدر و منزلت کا حامل رہا ہے۔ قرآن مجید کی آیات اور سفارشوں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی رو سے، مسلمان اس آسمانی کتاب کی قرائت کے سلسلہ میں بھی خاص اور اپنی نوعیت کے شرائط اور آداب کی رعایت کرتے رہے ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کے سلسلہ میں اس قسم کے آداب، اس آسمانی کتاب کی تلاوت کے ظاہری آداب شمار ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ روایتوں کے مطابق قرآن مجید کا ایک ظاہر اور کئی باطن ہیں، اس لئے اس کی قرائت کے آداب بھی کئی ظاہری اور باطنی آداب پر مشتمل ہیں، یہ ایک ایسا امر ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کی بعض آیات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی روایتوں میں بخوبی اشارہ کیا گیا ہے۔

تفصیلی جوابات

شائد، قرآن مجید کی تلاوت کے آداب کو ظاہری اور معنوی یا باطنی آداب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ظاہری آداب کے سلسلہ میں کچھ مقدمات اور شرائط کی رعایت کرنا ضروری

ہے، جو اپنی جگہ پر بیان ہوئے ہیں۔

قرآن مجید کے باطنی آداب، خود قرآن مجید کی آیات اور روایات سے معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے قرآن مجید کی تلاوت کرنے والوں کی یوں سفارش کی ہے کہ قرآن مجید کو ترتیل اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھنا چاہئے، اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: اور قرآن کو ترتیل (ٹھہر ٹھہر کر آرام سے اور ترتیب و سنجیدگی) کے ساتھ پڑھو۔[1] ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: اور جن لوگوں کو ہم نے قرآن دیا ہے وہ اس کی با قاعدہ تلاوت کرتے ہیں اور انہیں اس پر ایمان بھی ہے اور جو اس کا انکار کرے گا اس کا شمار خسارہ والوں میں ہوگا۔[2]

یہ دو آیات اور اس سلسلہ میں نقل کی گئی روایات، تلاوت کے ظاہری آداب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت کے باطنی آداب کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۱ کے ذیل میں نقل کی گئی ایک حدیث میں آیا ہے، کہ امام صادقؑ نے فرمایا ہے: جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کے حق کے مطابق تلاوت کرتے ہیں، وہ ہم اہل بیتؑ ہیں[3]۔

حقیقت میں امام صادقؑ نے تلاوت کرنے والوں کا حقیقی مصداق بیان کیا ہے۔ ممکن ہے بہت سے مومن قرآن مجید کی تلاوت کے ظاہری اور باطنی آداب کی رعایت کرنے کے نتیجہ میں قرآن مجید کے حقیقی قاریوں کے مقام پر پہنچ جائیں، اس لئے آیہ شریفہ: "كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ "،[4] کو بیان کرتے ہوئے ہمارے چھٹے امامؑ فرماتے ہیں: اس کا مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کو دقت کے ساتھ پڑھیں اور اس کے حقائق کو سمجھ لیں اور اس کے احکام پر عمل کریں اور اس کے وعدوں کے بارے میں پر امید رہیں اور اس کے انتباہات سے ڈریں، اس کی داستانوں سے عبرت حاصل کریں اور اس کے

اوامر کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور اس کے نواہی کو قبول کریں، خدا کی قسم آیات کو حفظ کرنے کا مراد سوروں کے حروف کو پڑھنا اور تلاوت کرنا نہیں ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کے حروف کو حفظ کیا ہے، لیکن خود قرآن کو ضائع کر دیا ہے، اس کا مراد صرف یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں غور و فکر اور اس کے احکام پر عمل کرو، جیسا کہ خداوند متعال ارشاد فرماتا ہے: یہ ایک مبارک کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تا کہ یہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں اور صاحبان عقل نصیحت حاصل کریں۔[5] اس نورانی حدیث کے پیش نظر ہم قرآن مجید کے باطنی آداب کے بارے میں مندرجہ ذیل مطالب کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں:

ا۔ جب تلاوت کے دوران کسی وعدہ پر پہنچ جائے، اس تک پہنچنے کی امید رکھنی چاہئے اور اگر کسی انتباہ پر پہنچ جائے، اس سے دو چار ہونے سے ڈرنا چاہئے، پس اگر بہشت یا جہنم سے متعلق آیات پر پہنچ جائے، تو رک کر خداوند متعال سے بہشت کی درخواست کرنی اور جہنم سے پناہ مانگنی چاہئے۔[6] امام علیؑ مومنین کی خصوصیات کے بارے میں فرماتے ہیں: لیکن وہ رات کے وقت کھڑے ہوکر قرآن مجید کی اس کے خاص آداب کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں، جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں ہمت افزائی ہو تو اس سے امید باندھتے ہیں تا کہ اسے حاصل کریں، ان کی حالت اس فرد کی جیسی ہوتی ہے جو کسی عزیز کی آمد کے شوق میں چشم براہ ہوتا ہے، لیکن جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں خوف و ترس ہے، تو دل وجان سے اس پر غور کرتے ہیں، ان کے رونگھٹے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے دل خوف و ہراس سے دو چار ہوتے ہیں اور اس خوف سے ان کے بدن ضعیف ہوتے ہیں، جیسا کہ وہ جہنم کے شعلوں اور آگ کی زنجیروں کی آواز سنتے ہیں، زمین پر گر جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوں جاری ہوتے ہیں، خدا سے پناہ چاہتے ہیں تا کہ (اس عذاب

سے) نجات پائیں۔[7]

۲۔قرآن مجید کی تلاوت کے دوسرے باطنی آداب میں سے، قرآن مجید کو سمجھنا اور اس کی آیات میں تدبر کرنا اور انہیں جاننا اور احکام الٰہی پر عمل کرنا ہے۔امام صادقؑ امیرالمومنینؑ سے نقل کرکے فرماتے ہیں: آگاہ رہنا کہ جس تلاوت میں تدبر نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔[8]

۳۔اس امر پر توجہ کرنا کہ قرآن مجید انسان کا کلام نہیں ہے اور خالق کی عظمت کو مد نظر رکھنا، کہ کلام کی تعظیم، متکلم کی تعظیم ہے۔

۴۔قرآن مجید کی تلاوت کے دوسرے باطنی آداب میں سے تخلیہ ہے یعنی خود کو تلاوت کرنے والی ہر آیت کے متناسب بنانا، اگر انبیاءؑ کی داستان یا کوئی قصہ پڑھتا ہے اس سے عبرت حاصل کرے اور اگر الٰہی اسماء و صفات کو پڑھتا ہے تو اس کے مصادیق کے بارے میں غور کرے۔[9]

۵۔قرآن مجید کی تلاوت کے باطنی آداب میں سے ایک اور چیز تخلیہ ہے، جو لوگ قرآن مجید سے کوئی مطلب سیکھنا چاہتے ہیں، قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے والے کو پہلے سے اپنے ذہن کو شبہات سے خالی کرنا چاہئے تاکہ وہ قرآن کو سمجھنے میں اثر نہ ڈالیں۔[10]

۶۔قرآن مجید کی تلاوت کے باطنی آداب میں اپنے سے ناپسند صفتوں خاص کر تکبر، ریاکاری[11] اور حسد و طمع کو دور کرنا ہے، کیونکہ اگر انسان ان بری صفتوں والے دل سے قرآن مجید کی تلاوت کرے تو خداوند متعال کے کلام کے معنی و مفہوم اس میں متجلی نہیں ہو سکتے ہیں۔

۷۔قرآن مجید کی تلاوت کے بلند ترین آداب میں سے روحی اور معنوی طہارت ہے۔ جب تک نہ انسان پاک ہو جائے، قرآن مجید اپنی حقیقت کو اسے نہیں دکھاتا ہے،

کیونکہ خود قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے: لایمسّہ الا المطہّر ون،[12] بقول شاعر:

پاک شو اول و پس دیدہ برآن پاک انداز

(پہلے خود پاک ہوجاؤ تا کہ قرآن مجید پر پاک نظر ڈال سکو گے)

۸۔قرآن مجید کی تلاوت کے معنوی آداب میں سے یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کا قاری قرآن مجید کو نہ صرف ایک متن کے عنوان سے دیکھے بلکہ ایک شفا بخش نسخہ کے عنوان سے دیکھے اور اس س اسی کی توقع رکھے۔ روایت میں آیا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو اسی نظریہ سے دیکھا ہے اور اس سے اپنی بیماریوں کی دوا حاصل کی ہے۔ خداوند متعال ایسے قاریوں کی وجہ سے، جو دلوں کی شفا کو قرآن مجید سے حاصل کرتے ہیں، لوگوں کے دشمنوں کو دور کرتا ہے اور ان پر باران رحمت نازل کرتا ہے۔[13]

حواشی

[1] مزمل،4.

[2] بقرہ، 121.

[3] کلینی، محمد بن یعقوب، کافی، ج1، ص215، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، 1365 ہ ش.

[4] سورۃ ص، 29.

[5] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج1، ص432، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، 1374 ہ ش.

[6] مشہدی، محمد، تفسیر کنز الدقائق و بحر الغرائب، ج2، ص 132، سازمان انتشارات وزارت ارشاد، تہران، 1368 ہ ش.

[7] نہج البلاغہ، صبحی صالح، صفحہ 304.

[8] کافی، ج1، ص36.

[9] کاشفی سبزواری، ملا حسین، جواہر التفسیر، ص270، دفتر نشر میراث مکتوب، تہران،

[10] ایضا۔

[11] إِنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ فُلَانٌ قَارِءٌ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ لِيَطْلُبَ بِهِ الدُّنْيَا وَ لَا خَيْرَ فِي ذَلِكَ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ لِيَنْتَفِعَ بِهِ فِي صَلَاتِهِ وَ لَيْلِهِ وَ نَهَارِهِ . نك: حر عاملی، محمد بن حسن، وسائلالشیعة، ج 6، ص182، آل البیت علیہ السلام، قم، 1409ھ.

[12] واقعہ، 79.

[13] إِ وَ رَجُلٌ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَوَضَعَ دَوَاءَ الْقُرْآنِ عَلَى دَاءِ قَلْبِهِ فَأَسْهَرَ بِهِ لَيْلَهُ وَ أَظْمَأَ بِهِ نَهَارَهُ وَ قَامَ بِهِ فِي مَسَاجِدِهِ وَ تَجَافَى بِهِ عَنْ فِرَاشِهِ فَبِأُولَئِكَ يَدْفَعُ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْبَلَاءَ وَ بِأُولَئِكَ يُدِيلُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ مِنَ الْأَعْدَاءِ وَ بِأُولَئِكَ يُنَزِّلُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ الْغَيْثَ مِنَ السَّمَاءِ فَوَ اللَّهِ لَهَؤُلَاءِ فِي قُرَّاءِ الْقُرْآنِ أَعَزُّ مِنَ الْكِبْرِيتِ الْأَحْمَرِ . کافی، ج2، ص627.

سورہ آل عمران کی آیت ۳۱ و ۳۲ میں کونسا اہم مطلب بیان کیا گیا ہے؟

مختصر جواب

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۱ ق ۳۲ [1] کے بارے میں تفاسیر میں دوشان نزول بیان کئے گئے ہیں۔[2] پہلا یہ کہ کچھ لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پروردگار عالم سے اپنی محبت و دوستی کا دعویٰ کیا، جبکہ یہ لوگ خداوند متعال کے احکام پر عمل کم کرتے تھے، یہاں پر یہ دو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ دوسرا یہ کہ، نجران کے بعض عیسائی، مدینہ منورہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے کلام کے ضمن میں، اظہار کیا کہ: حضرت عیسیٰ سے ہمارے غیر معمولی احترام کی وجہ، خداوند متعال سے ہماری محبت ہے۔

جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ انسان کے روح و روان کی فطری حیات محبت ہے کہ اس میں خداوند متعال کی طرف سے ایک عطیہ کے طور پر ڈالی گئی ہے اور انسان کی اپنے پروردگار سے محبت اس کی معرفت اور خداشناسی کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ اس آیہ شریفہ میں خداوند متعال نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرکے فرمایا ہے کہ: اے پیغمبر؛ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کرے گا اور

تمہارے گناہوں کو بخش دے گا کہ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو کہ جو اس سے روگردانی کرے گا تو خدا کافرین کو ہرگز دوست نہیں رکھتا ہے۔ انسان کے اہم پہلوؤں میں سے ایک جذبات کا پہلو ہے کہ اس کا انسان کے اعتقادات پر موثر رول ہوتا ہے، یہاں تک کہ بعض احادیث میں دین کی محبت سے تفسیر کی گئی ہے۔ امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ: دین محبت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔[3] حقیقی محبت انسان کو اپنے محبوب کی اطاعت کرنے پر مجبور کرتی ہے اور جو کچھ محبوب اس سے چاہتا ہے، وہ بہترین صورت میں اس کی فرمانبرداری کرتا ہے، اس لحاظ سے امام صادقؑ مذکورہ حدیث میں، اس آیہ شریفہ کی تلاوت فرماتے ہیں: اے پیغمبر؛ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہوتو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کرے گا۔[4]

خداوند متعال اس آیہ شریفہ میں پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم یتا ہے کہ:(مومنین سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اس آیہ شریفہ کے مطابق خداوند متعال کی دوستی اسی وقت متحقق ہوتی ہے کہ انسان اس کے پیغمبر(ص) کی اطاعت کرے، یعنی ان احکام اور دستورات پر عمل کرے جو پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ پہنچائے گئے ہیں۔ شریعت کے احکام پر عمل کئے بغیر خدا کی دوستی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس بنا پر جو افراد دین کے احکام پر عمل کئے بغیر خدا کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہی اور حتی اس کے عاشق ہونے یا فنا فی اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ جھوٹ بولتے ہیں اور گمراہ ہیں اور اس قسم کی دوستی کو خداوند متعال قبول نہیں کرتا ہے، بلکہ خداوند متعال سے دوستی اس وقت قابل قبول ہے کہ انسان پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرے اور شرعی احکام پر عمل کرے۔

بعد والی آیہ شریفہ میں خداوند متعال اور پیغمبر خدا(ص) کی اطاعت کی تاکید کی گئی

ہے اور خداوند متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمان دیتا ہے کہ لوگوں سے کہد یجئے کہ: اللہ اور رسول کی اطاعت کرو کہ جو اس سے روگردانی کرے گا تو خدا کافرین کو ہرگز دوست نہیں رکھتا ہے۔

واضح تر الفاظ میں، خدا کو دوست رکھنے کا لازمہ اس کے دین کو قبول کرنا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے۔ جو شخص خداوند متعال کو دوست رکھتا ہو، اس کے لئے خداوند متعال اور اہل بیت علیہم السلام کو دوست رکھنا ضروری ہے، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں (اہل بیت کو) دوست رکھتے ہیں اور جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوست رکھتا ہو، وہ خدا سے بھی محبت کرتا ہے اور ان دو محبتوں کے درمیان تفکیک ناممکن ہے، کیونکہ خداوند متعال نے ارشاد فرمایا ہے: جو رسول کی اطاعت کرے گا اس نے اللہ کی اطاعت کی ہے۔[5]

محبت صرف دل سے دوست رکھنا اور ہر قسم کے اثر سے خالی نہیں ہے، بلکہ اس کے آثار انسان کے عمل میں منعکس ہونے چاہئے۔ جو شخص پروردگار کے ساتھ محبت و عشق کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی سب سے پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرے۔

حقیقت میں یہ محبت کا ایک فطری اثر ہے جو انسان کو اپنے محبوب کی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ کچھ کمزور محبتیں بھی پائی جائیں جن کی شعائیں دل سے باہر نہ نکلی ہوں۔ لیکن اس قسم کی محبتیں اس قدر ناچیز ہیں کہ انہیں محبت نہیں کیا جاسکتا ہے، ایک بنیادی محبت کے ضرور عملی آثار ہوتے ہیں اور اس قسم کی محبت رکھنے والے کو محبوب اپنے ساتھ ملاتا ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق کوشش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

خلاصہ کے طور پر ان دو آیتوں کی تفسیر کے بارے میں قابل بیان ہے کہ اگر کوئی شخص خداوند متعال سے دوستی اور محبت کا دعویٰ کرتا ہے، تو حقیقت میں یہ محبت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمائشات اور دستورات پر عمل کرنے سے متحقق ہوتی ہے، اور اس کے بغیر

مبالغہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

قرآن مجید مذکورہ دو آیتوں میں ارشاد فرماتا ہے: اے پیغمبر؛ کہد یجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا کہ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ کہد یجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو کہ جو اس سے روگردانی کرے گا تو خدا کافرین کو ہرگز دوست نہیں رکھتا ہے۔

اس مسئلہ کے ضمن میں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محبت یک طرفہ نہیں ہوسکتی ہے، کیونکہ ہر محبت، محبت کرنے والے کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے مطالبات کو عملی جامہ پہنائے اور ایسی حالت میں بیشک محبوب بھی اس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔[6]

حواشی

[1]۔"قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ * قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لا يُحِبُّ الْكافِرِينَ".

[2]۔طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج 2، ص 733، ناصر خسرو، تہران، 1372 ش؛ تفسیر المنار، بہ نقل از مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، ج 2، ص 512، دار الکتب ال إسلامیۃ، تہران، 1374 ش.

[3]۔شیخ صدوق، الخصال، ص 21، جماعۃ المدرسین فی الحوزۃ العلمیۃ، قم، 1362 ش.

[4]۔آل عمران، 31.

[5]۔نساء، 80، "مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطاعَ اللَّهَ".

[6]۔اس سلسلہ میں مفسرین کی مفصل تفسیر سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ملاحظہ ہو: طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج 3، ص 157۔162، دفتر انتشارات اسلامی، قم، 1417 ق؛ جعفری، یعقوب، کوثر، ج 2، ص 104۔105، بی جا، بی تا؛ مغنیہ، محمد جواد، تفسیر الکاشف، ج 2، ص 45، دار الکتب ال إسلامیۃ، تہران، 1424 ق؛ مصطفوی، حسن، تفسیر روشن، ج 4، ص 159، مرکز نشر کتاب، تہران، 1380 ش؛ تفسیر نمونہ، ص 513۔514.

قرآن مجید کے مطابق انسان کی کن طریقوں سے آزمائش کی جاتی ہے؟

مختصر جواب

خداوند متعال قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: میں نے انسانوں کو پیدا کیا ہے تاکہ ان کی آزمائش کروں کہ، ان میں سے کون بہتر عمل انجام دیتا ہے۔ خدا کی آزمائش و امتحان کا مفہوم، ہماری آزمائشوں سے مختلف ہے۔ ہماری آزمائشیں زیادہ تر پہچان حاصل کرنے اور ابہامات اور جہالت کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔لیکن خدا کی آزمائش حقیقت میں وہی پرورش و تربیت ہے، یعنی خداوند متعال کی آزمائش و امتحان میں تربیت، پرورش اور کمال حاصل کرنے کا زمانہ پایا جاتا ہے۔

خداوند متعال انسانوں کی طاقت کے مطابق مختلف طریقوں سے ان کا امتحان لیتا ہے۔کبھی مشکلات اور سختیوں کے ذریعہ، کبھی خیر و شر کے طریقے سے اور کبھی مال و سرمایہ اور اولاد کی فراوانی سے اور کبھی مصیبتوں وغیرہ سے امتحان لیتا ہے۔

تفصیلی جوابات

الٰہی آزمائش کا مفہوم

جس چیز کو اردو زبان میں آزمائش اور آزمانا کہا جاتا ہے، وہ چیز قرآن مجید میں

مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ مثال کے طور پر ابتلاء بلاء فتنہ، اور تمحیص خداوند متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ میں نے انسانوں کو پیدا کیا تا کہ ان کی آزمائش کروں کہ ان میں سے کون بہتر عمل انجام دیتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا ہے: اس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں احسن عمل کے اعتبار سے کون بہتر ہے اور وہ صاحب عزت بھی ہے اور بخشنے والا بھی ہے۔[1] خداوند متعال کی طرف سے آزمائش اور امتحان کا ہماری آزمائش اور امتحان سے کافی فرق ہے۔ ہماری آزمائش زیادہ تر پہچان حاصل کرنے اور ابہامات اور جہالت کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے۔[2] لیکن خداوند متعال کی آزمائش و امتحان میں تربیت، پرورش اور کمال حاصل کرنے کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ اور وہ پرورش اور کمال کو انسانوں کے لئے وجود میں لاتا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ جیسے انبیائے الٰہی سخت اور ناقابل برداشت آزمائشوں اور امتحانات کے بعد ہی عالی ترین مقامات پر فائز ہوئے ہیں۔[3]

قرآن مجید میں الٰہی آزمائشوں کے نمونے

خداوند متعال کی طرف سے انسانوں کی آزمائش سنت الٰہی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ یہ کہدیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کا امتحان نہیں ہوگا۔ بیشک ہم نے ان سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے اور اللہ تو بہرحال یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان میں کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں۔[4]

کبھی خداوند ایک عمومی امتحان کا نام لیتا ہے جو خدا کے تمام بندوں سے متعلق ہوتا

ہے، اور ارشاد فرماتا ہے: کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ یہ کہدیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور ان کا امتحان نہیں ہوگا۔[5]

کبھی قرآن مجید کچھ خاص امتحانات کے ایک سلسلہ سے پردہ اٹھاتا ہے جو بعض خاص افراد اور گروہوں کے بارے میں تھے، اور یہ موضوع پیغمبروں اور ان کی قوموں کی داستانوں کے مانند قرآن مجید کی کچھ داستانوں اور قصوں پر مشتمل ہے۔

قرآن مجید میں عام امتحانات کے بارے میں آیات کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان سب کا یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم ذیل میں قرآن مجید میں الٰہی امتحانات میں سے بعض کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

1۔ مشکلات اور سختیاں:

خداوند متعال مشکلات اور سختیوں کے ذریعہ انسانوں کا امتحان لیتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے: اور ہم یقیناً تمھیں تھوڑے خوف تھوڑی بھوک اور اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور اے پیغمبر ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیدیں۔[6]

مشکلات اور دشواریاں بھٹی کے مانند ہیں جو لوہے کو مضبوطی اور استقامت بخشتی ہے، اور انسان بھی مشکلات اور حوادث کی بھٹی میں قوی اور طاقتور بن جاتا ہے اور اس میں اپنی زندگی اور سعادت کی راہوں کی رکاوٹوں کو ہٹانے کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ بلا اور مصیبتوں میں تربیت کا اثر ہوتا ہے اور یہی مصیبتیں فرد کو تربیت کرتی ہیں اور معاشرہ کو بیدار کرتی ہیں۔ سختیاں خفتہ انسانوں کو بیدار کرنے والی اور ان کے عزم ا ور ارادوں کو متحرک کرنے والی ہوتی ہیں ۔ مصائب، آہن و فولاد کی جلا کے مانند زیادہ تر انسان کی روح سے

رابطہ رکھتے ہیں، اور افراد کو مصمم تر فعال تر اور مضبوط تر بناتے ہیں، کیونکہ حیات کی خاصیت یہ ہے کہ سختیوں اور مشکلات کے مقابلے میں مقاومت کرے اور ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے، سختی کیمیا کے مانند ماہیت کو تبدیل کرنے کی خاصیت رکھتی ہے اور انسان کی جان اور روح میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔[7]

2۔ برائی اور اچھائی:

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے کہ: اور ہم تو اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے۔[8] پس اچھائیاں بھی امتحان کا سبب بن سکتی ہیں، مثال کے طور پر کسی کو مال و دولت یا کوئی ایسی مسئولیت ملتی ہے، جو اس کی عزت و آبرو میں اضافہ ہونے کا سبب بنتی ہے اور وہ شخص اس حالت سے بخوبی استفادہ نہیں کرتا ہے اور شیطان اسے گمراہ کرتا ہے۔

3۔نعمت کی فراوانی:

خداوند متعال کے امتحانات ہمیشہ سخت حوادث و مشکلات کے ذریعہ ہی نہیں ہوتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی خداوند متعال اپنے بندوں کا نعمتوں کی فراوانی اور کامیابیوں سے بھی امتحان لیتا ہے۔[9] چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید بقول حضرت سلیمانؑ ارشاد فرماتا ہے: یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے وہ میرا امتحان لینا چاہتا ہے کہ میں شکریہ ادا کرتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں اور جو شکریہ ادا کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کے لئے کرے گا اور جو کفران نعمت کرے گا اس کی طرف سے میرا پروردگار بے نیاز اور کریم ہے۔[10]

جو لوگ نعمتوں میں غرق ہوتے ہیں اور ہر اعتبار سے انہیں مادی وسائل اور امکانات مہیا ہوتے ہیں، ان کا امتحان یہ ہے کہ ان حالات میں وہ نعمتوں کا شکریہ بجالانے کا

فریضہ انجام دیتے ہیں یا نہیں اور محتاجوں اور فقیروں کی مدد کرتے ہیں یا غفلت، غرور اور خود خواہی میں غرق ہوتے ہیں؟

4۔ اولاد:

قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے: اور جان لو کہ یہ تمہاری اولاد اور تمہارے اموال ایک آزمائش ہیں۔[11]

5۔ ایمان و کفر:

قرآن مجید جہنم کے نگہبانوں اور ان کی تعداد کے بارے میں یاد دہانی کراتا ہے کہ انیس (19) فرشتے جہنم کی حفاظت اور نگہبانی کرتے ہیں، اور اس کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ یہ رپورٹ ان لوگوں کے لئے امتحان و آزمائش کا وسیلہ ہے، جو غیب اور پوشیدہ امور کے بارے میں قوی ایمان رکھتے ہیں، وہ اس رپورٹ کو صمیم قلب سے قبول کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ کے لوگ اس کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اور ہم نے جہنم کا نگہبان صرف فرشتوں کو قرار دیا ہے اور ان کی تعداد (19) کو کفار کی آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔[12]

6۔ زمین کی زینت:

قرآن مجید ایک جگہ پر، جو کچھ زمین پر قرار پایا ہے، اسے امتحان کا سبب جانتا ہے، اور اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: بیشک ہم نے روئے زمین کی ہر چیز کو زمین کی زینت

قرار دیدیا ہے تاکہ ان لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے۔[13]

حواشی:

[1]۔ ملک، 2.

[2]۔ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 1، ص 527، دارالکتب الاسلامیۃ، طبع بیست و یکم، 1365 شمسی.

[3]۔ بقرہ، 124. وَإِذِ ابْتَلَى إِبْراهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِماتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قالَ إِنِّي جاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِماماً قالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قالَ لا يَنالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ.

[4]۔ عنکبوت، 3و2.

[5]۔ عنکبوت، 2.

[6]۔ بقرہ، 155.

[7]۔ سوال نمبر 2056 (سائٹ: 2418) کے عنوان کا اقتباس۔

[8]۔ انبیاء، 35.

[9]۔ تفسیر نمونہ، ج 1، ص 533.

[10]۔ نمل، 40.

[11]۔ انفال، 28.

[12]۔ مدثر، 31.

[13]۔ کہف، 7.

دعائے امن یجیب المضطر کہاں پر آئی ہے؟

مختصر جواب

اَمَّنۡ يُّجِيۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكۡشِفُ السُّوۡٓءَ کا جملہ درحقیقت قرآن مجید کے سورہ نمل کی ۶۲ ویں آیت ہے خداوند متعال فرماتا ہے: بھلا وہ کون ہے جو مضطر کی فریاد کوسنتا ہے جب وہ اس کوآواز دیتا ہے اوراس کی مصیبت کو دور کرتا ہے

اگر چہ خداوند متعال شرائط پورے ہونے کی صورت میں ہرایک کی دعا کوقبول کرتا ہے،لیکن مذکورہ آیہ شریفہ میں، مضطر کے عنوان پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دعا قبول ہونے کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ انسان عالم اسباب سے امیدوں کو بالکل توڑ کے اپنے پورے قلب وروح کو خداوند متعال کے اختیار میں قرار دے دے، اورتمام چیزوں کو اسی سے متعلق جانے اورتمام مشکلات کے حل کو اسی کے ہاتھ میں دیکھے، اور یہ ادراک و عقیدہ اضطرار کی حالت میں ہاتھ آتا ہے اگر چہ یہ حالت افراد کے لئے عدم اضطرار میں بھی پائی جاتی ہے،لیکن عام انسان اس طرح نہیں ہیں۔

البتہ اگر انسان اس مرحلہ پر پہنچے تو اس نے دعا قبول ہونے کی سب سے اہم شرائط حاصل کی ہیں۔

تفصیلی جوابات

اَمَّنۡ يُّجِيۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكۡشِفُ السُّوۡٓءَ کا جملہ درحقیقت قرآن

مجید کے سورہ نمل کی ۶۲ ویں آیت ہے خدا وند متعال فرماتا ہے: بھلا وہ کون ہے جو مضطر کی فریاد کو سنتا ہے جب وہ اس کو آواز دیتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے

وضاحت یہ ہے کہ امام صادقؑ اور امام باقرؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ، اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں فرمایا ہے: وہ خدا جو مضطر کی دعا کو قبول کرتا ہے، یعنی وہ، جو شخص شدید مشکلات کی وجہ سے اس کا سہارا لیتا ہے اور وہ، جو انسان کو تکلیف پہچانے والی چیز کو دور کرتا ہے[1]۔

اگر چہ خداوند متعال شرائط پورے ہونے کی صورت میں ہر ایک کی دعا کو قبول کرتا ہے، لیکن مذکورہ آیہ شریفہ میں، مضطر کے عنوان پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دعا قبول ہونے کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ انسان عالم اسباب سے امیدوں کو بالکل توڑ کے اپنے پورے قلب و روح کو خداوند متعال کے اختیار میں قرار دے، اور تمام چیزوں کو اسی سے متعلق جانے اور تمام مشکلات کے حل کو اسی کے ہاتھ میں دیکھے، اور یہ ادراک وعقیدہ اضطرار کی حالت میں ہاتھ آتا ہے اگر چہ یہ حالت افراد کے لئے عدم اضطرار میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن عام انسان اس طرح نہیں ہیں۔

صحیح ہے کہ عالم، عالم اسباب ہے، اور مومن اس سلسلہ میں حتی الامکان کوشش کرتا ہے لیکن کبھی عالم اسباب میں غرق نہیں ہوتا ہے، بلکہ ہر چیز کو اس کی پاک ذات کی برکت جانتا ہے اور اسباب کے پردے کے پیچھے مسبب الاسباب کو دیکھتا ہے اور ہر چیز کو اسی سے چاہتا ہے۔

البتہ اگر انسان اس مرحلہ پر پہنچے تو اس نے دعا قبول ہونے کی سب سے اہم شرائط حاصل کی ہیں۔

دلچسپ بات ہے کہ بعض روایتوں میں اس آیت کی تفسیر حضرت مہدی (عج) کے قیام سے کی گئی ہے۔

ایک روایت میں امام باقرؑ نے فرمایا ہے: خدا کی قسم، گویا میں مہدی (عج) کو دیکھ رہا ہوں کہ حجر الاسود سے ٹیک لگا کر، خدا سے اپنے حق میں دعا کرتے ہیں، اس کے بعد فرمایا: خدا کی قسم کتاب خدا میں اور آیہ امن یجیب المضطر ۔۔۔ میں مضطر وہی ہیں۔

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ یوں فرماتے ہیں: یہ آیہ شریفہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مہدی (عج) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خدا کی قسم مضطر وہ ہیں۔ جب وہ مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز بجا لائیں گے اور بارگاہ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کریں گے ان کی دعا قبول ہوگی، اضطرار برطرف ہوگا اور انہیں زمین پر خلیفہ قرار دیا جائے گا[2]

البتہ ظاہر ہے کہ اس تفسیر سے مراد، اس آیہ شریفہ کو حضرت مہدی (عج) کے وجود سے مخصوص کرنا نہیں ہے، بلکہ آیہ شریفہ کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ ان میں سے ایک واضح مصداق حضرت مہدی (عج) ہیں، جب پوری دنیا میں فساد پھیلا ہوگا، دروازے بند ہوئے ہوں گے، خنجر ہڈیوں تک پہنچ چکا ہوگا اور انسانیت تعطل کا شکار ہو چکی ہوگی، اضطرار کی حالت پوری دنیا میں نمایاں ہوگی، اس وقت وہ (امام مہدی) زمین کے مقدس ترین نقطہ پر دعا کے لئے ہاتھ بلند کریں گے اور حل مشکلات کی دعا کریں گے اور خداوند متعال ان کی اس دعا کو ان کے مقدس عالمی انقلاب کا سرآغاز قرار دے گا اور و یجعلکم خلفاء الارض [3] کے مصداق کے عنوان سے انہیں اور ان کے دوستوں کو زمین کا خلیفہ قرار دے گا۔[4]

آخر میں ایک نکتہ کی یاد دہانی کرانا ضروری ہے۔

اگر چہ بزرگوں کی ایک تعداد نے فرمایا ہے کہ: بہتر ہے انسان جب مشکلات اور سختیوں سے دوچار ہو جائے تو اس آیہ شریفہ کو پڑھے[5] اور عام لوگ اس آیہ شریفہ کو دعا کے عنوان سے جانتے ہیں، لیکن اس پر مزید فکر و غور کرنے کی ضرورت ہے جو اس نکتہ کی طرف ہماری راہنمائی کرتے ہیں کہ اس آیت میں دعا کا سیاق نہیں پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے جب

ہمارے ائمہؑ اس آیت سے دعا کا ارادہ کرتے تھے تو یوں پڑھتے تھے: يَا مَنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذا دَعاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوءِ ارْحَمْنِي وَ اكْشِفْ مَا بِي مِنْ غَمٍّ وَ كَرْبٍ وَ وَجَعٍ وَ دَاء.[6] (اے وہ جو مضطر کی دعا کو قبول کرتا ہے اور پریشانیوں اور مشکلات کو دور کرتا ہے مجھ پر رحم فرما اور ہر قسم کے اضطراب، غم و اندوہ اور درد و رنج کو مجھ سے دور فرما۔

حواشی

[1] مجلسی، محمد باقر، بحارالأنوار، ج68،ص118،مؤسسہ الوفاء، بیروت، 1404ھ

[2] مجلسی، محمد باقر، بحارالأنوار، ج51،ص48.

[3] نمل، 62.

[4] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج15،ص520 - 522، ناشر: دار الکتب ال إسلامیہ، طبع تہران، طبع اول، 1374ھ ش.

[5] حاج میرزا جواد آقا، ملکی تبریزی، المراقبات، ص261.

[6] مجلسی، محمد باقر، بحارالأنوار، ج92،ص103.

جمادات اور نباتات خداوند متعال کی تسبیح کیسے کرتے ہیں؟

مختصر جواب

کائنات کی مخلوقات کے بارے میں انسان کی معلومات انتہائی محدود ہیں۔مخلوقات خداوند متعال کی تسبیح کیسے کرتے ہیں؟ یہ ان مسائل میں سے ہے کہ انسان ابھی تک اس کی کیفیت کو معلوم نہیں کر سکا ہے۔

متعدد آیات و روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ ہستی کے تمام اجزاء، پروردگار کی تسبیح پڑھنے والے ہیں۔ہستی کے اجزاء کی تسبیح کی کیفیت کے بارے میں مفسرین کے درمیان دو نظریے پائے جاتے ہیں:

۱۔مخلوقات کی زبان حال سے تسبیح، کہ اپنے پورے وجود سے کہتی ہیں کہ: اگر مجھ میں کوئی عیب ہے تو وہ میری ذات کا لازمہ ہے اور خداوند متعال اس عیب سے منزہ و پاک ہے۔

۲۔مخلوقات کی زبان قال سے تسبیح، البتہ موجودات کا قیل و قال اور ان کی گفتگو، انسانوں اور حیوانوں کے درمیان رائج صورت میں نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی خاص نوعیت ہے کہ ابھی تک انسان کا علم اس کی کیفیت معلوم نہیں کر سکا ہے۔

تفصیلی جوابات

کائنات کی مخلوقات کے بارے میں انسان کی معلومات انتہائی محدود اور اس کی لاعلمی کی نسبت سے ناچیز ہیں۔ ہم چیونٹیوں، کیڑوں اور حشرات کے علاوہ بہت سی دوسری مخلوقات کی باہمی گفتگو کرنے کی کیفیت اور باہمی روابط کے بارے میں آگاہی نہیں رکھتے ہیں، حتی کہ ہم میں ان کی آوازیں سننے کی طاقت بھی نہیں ہے، کیونکہ ہماری سننے کی طاقت صرف ان آوازوں کو سن سکتی ہے، جن کی فری کوینسی (frequency) ایک خاص حد میں ہو اور اس سے زیادہ یا کم والی فری کوینسی کی آوازیں سننے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، جبکہ یہ مخلوقات قطعا آپس میں تعلقات رکھتی ہیں۔

مخلوقات خداوند متعال کی تسبیح کیسے کرتی ہیں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ انسان کو ابھی تک اس کا علم حاصل نہیں ہوسکا ہے، اس بنا پر ہم اس کی کیفیت کا تصور نہیں کرسکتے ہیں۔

متعدد آیات و روایات میں عالم ہستی کی تمام مخلوقات کی تسبیح کی صراحت کی گئی ہے۔[1]

تسبیح یعنی خداوند متعال کو مخلوقات میں پائی جانے والی ہر قسم کی ناتوانیوں اور عیب ونقص سے منزہ اور پاک جاننا۔

امام صادقؑ سے سبحان اللہ کے بارے میں سوال کیا گیا۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا: یعنی بندگی کے لحاظ سے خداوند متعال کے، ہر قسم کی برائی سے پاک ومنزہ ہونے کا اظہار کرنا۔[2]

مخلوقات (جمادات و نباتات) کی تسبیح کی کیفیت کے بارے میں مفسرین نے دو نظریے پیش کئے ہیں:

۱۔ زبان حال سے تسبیح اور ۲۔ زبان قال سے تسبیح

۱۔ زبان حال سے تسبیح:

بعض مفسرین نے مخلوقات کی تسبیح کو زبان حال کی تسبیح سے تعبیر کیا ہے اور اس کی تمام ہستی اور مخلوقات کی ذات باری تعالی اور اس کے صفات کمالیہ کی دلالت سے تفسیر کی ہے، اور مخلوقات درحقیقت اپنے خالق کی زبان حال میں توصیف کرتی ہیں (رنگ رخسار خبری می دہد از سر ضمیر) اور کہتی ہیں: اگر مجھ میں کوئی عیب ہے تو وہ میری ذات کا لازمہ ہے اور خداوند متعال اس عیب سے منزہ و پاک ہے۔

ابو نصر فارابی، طبرسی، فخر رازی اور آلوسی، مخلوقات کی تسبیح کو زبان حال سے جانتے ہیں۔ تفسیر نمونہ میں بھی یہی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ فارابی، مخلوقات کی تسبیح اور نماز کے بارے میں تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''صلّت السماء بدورانها و الأرض برجحانها و المطر بهطلانه'' (آسمان اپنی گردش سے بارگاہ الٰہی میں نماز بجالاتا ہے، زمین ہلنے سے نماز ادا کرتی ہے اور پانی برسنا، بارش کی نماز ہے[3]) اس نظریہ کے مطابق مخلوقات اور کائنات کے ذرات کی تسبیح کا تصور اور اس کی تصدیق کافی حد تک قابل ادراک ہے، کیونکہ کائنات کا ہر ذرہ جو بھی کام انجام دیتا ہے، وہی اس کی تسبیح ہے۔

۲۔ زبان قال سے تسبیح:

اس قسم کی تسبیح اور ستائش سے مراد یہ ہے کہ تمام مخلوقات عاقل ہیں اور صاحب شعور ہیں اور اس کے علاوہ کہ زبان حال سے پروردگار عالم کی تسبیح اور حمد و ثنا بجالاتی ہیں، زبان قال سے بھی خدا کی ستائش میں مشغول ہیں۔ لیکن ہم اجمالی طور پر جانتے ہیں کہ اس قسم کی تسبیح اس پر مبنی ہے کہ تمام حیوانات اور جمادات اپنی شان کے تناسب سے ادراک اور نفوس ناطقہ رکھتے ہیں اور ہر مخلوق اپنے نفس ناطقہ سے اپنے پروردگار کی تسبیح کرتی ہے اور کائنات کے ذرے ذرے میں مخلوقات کی تسبیح کا ایک شور غوغا برپا ہے۔ لیکن اس کو سننا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور صرف اہل دل اور وہی افراد کائنات میں ہونے والی تسبیح کی

آواز سن سکتے ہیں جنہوں نے مادیات کے پردے چاک کئے ہوں۔

اس سلسلہ میں مولانا رومی نے کیا خوب فرمایا ہے:

گر تو را از غیب چشم باز شد

با تو ذرات جہان ہمراز شد

نطق آب و نطق خاک و نطق گل

ہست محسوس حواس اہل دل

معاصر علماء میں سے جو اس نظریہ کے قائل ہیں، ان میں سے علامہ طبا طبائی اور شہید مرتضی مطہری کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ طبا طبائیؒ فرماتے ہیں: تمام مخلوقات کی تسبیح حقیقی اور تسبیح زبان قال ہے اور قال کے لئے ضروری نہیں ہے کہ بالکل الفاظ کو سنا جائے اور طے شدہ ہو۔[4]

اس بنا پر نباتات اور جمادات کی تسبیح بھی حقیقی تسبیح اور تسبیح زبان قال ہے اور یہ کہ ہم ملائکہ اور مومنین کی تسبیح کو زبان قال کی تسبیح کہیں اور دوسری مخلوقات کی تسبیح کو زبان حال کی تسبیح کہیں صحیح نہیں ہے۔ انسان کو اہل دل، اہل معنی اور اہل حقیقت بننا چاہیے تاکہ ماورائے طبیعت کو بھی ادراک کر سکے۔ جب ہم یہ ادراک حاصل کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام مخلوقات کیسے درک کرنے والے، باہوش، عالم اور اپنے پروردگار کی حمد وثنا اور تسبیح کرنے والی ہیں۔

قرآن مجید حضرت داودؑ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

آپ ان کی باتوں پر صبر کریں اور ہمارے بندے داود کو یاد کریں جو صاحب طاقت بھی تھے اور بیحد رجوع کرنے والے بھی تھے ہم نے ان کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ ان کے ساتھ صبح و شام تسبیح پروردگار کریں اور پرندوں کو ان کے گرد جمع کر دیا تھا سب

ان کے فرمانبردار تھے[5]

مذکورہ آیات میں دو نکتے ایسے ہیں جو مخلوقات کی زبان قال میں تسبیح کرنے کی تائید کرتے ہیں: ان میں سے ایک اپنے پروردگار کی تسبیح کرنے میں پہاڑوں اور پرندوں کا حضرت داود کا ساتھ دینا: معہ یسبحن اگر مخلوقات کی تسبیح سے یہاں پر مراد زبان حال سے تسبیح ہوتی تو ان کا داود کا ساتھ دینا بے معنی ہوتا۔ آیات کا سیاق، ایک ہی سیاق ہے۔ اس بنا پر اس کے معنی نہیں ہیں کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو ہم زبان حال کی تسبیح سے نسبت دے دیں، اور حضرت داود کی تسبیح کو زبان قال کی، تسبیح سے نسبت دیں، کیونکہ زبان حال کی تسبیح ہمیشہ اور داود کے بغیر بھی موجود ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ آیہ شریفہ میں فرمایا گیا ہے کہ: صبح و شام کے وقت پہاڑ اور پرندے تسبیح پروردگار کرنے میں حضرت داود کا ساتھ دیتے تھے۔ ممکن ہے ہم یہ کہیں کہ صبح و شام، شب و روز کی طرف کنایہ ہے اور درنتیجہ تسبیح دائمی ہے۔ لیکن پہلے والے نکتہ [داود کا ساتھ دینے) کے پیش نظر قابل بیان ہے کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داود کے ساتھ ہمزمان اور ہم صدا تسبیح میں شرکت کرتے تھے۔ یعنی جب داودؑ تسبیح شروع کرتے تھے تو، پرندے اور پہاڑ بھی اس کے ہم نوا ہوتے تھے۔ پس عشی اور ابکار سے مراد طلوع وغروب کے حقیقی معنی ہیں، اور اس صورت میں تسبیح کے معنی پہاڑوں اور پرندوں کا وجود خدا کے وجود کی دلیل اور زبان حال کی تسبیح کی تفسیر نہیں ہوسکتی ہے اور جس طرح ہم نے بیان کیا، اس قسم کی تسبیح ہمیشہ اور ہر زمانہ میں موجود ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ہے کہ صبح و شام اور حضرت داودؑ کے وجود سے مخصوص ہو۔ حضرت داودؑ سن رہے تھے کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے ہیں، ایک اور کان تھا جس سے وہ اشیاء کے باطن اور ملکوت تک پہنچ چکے تھے اور ان کی ملکوتی آواز سنتے تھے۔ اگر ہمارے باطنی کان کھل جائیں تو ہم بھی سنیں گے۔[6]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتھیلی پر کنکریوں کی گفتگو کی داستان [7] کے بارے میں شہید مطہری (رح) فرماتے ہیں: یہاں پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ یہ نہیں تھا کہ کنکریوں کو تسبیح پڑھائی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ یہ تھا کہ لوگوں کے کانوں کو کھول دیا اور انہوں نے کنکریوں کی آواز سنی۔ وہ کنکریاں تو ہمیشہ تسبیح پڑھتی تھیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ اس آواز کو ان کانوں کو سنانا تھا نہ کہ کنکریوں کو بات کرانا۔[8]

اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ مخلوقات کی قولی وکلامی تسبیح کو ممکن ہے کہ پاک دل اور خود ساختہ انسان ادراک کرسکیں۔

حواشی

[1] اسراء،44: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اس کی تسبیح کررہے ہیں اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہیں کرتی ہو، یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو۔

[2] الکافی ج 1 ص، 118 حدیث 10:... هِشَامِ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عليه السلام عَنْ سُبْحَانَ اللَّهِ فَقَالَ أَنَفَةٌ لِلَّهِ

[3] تسبیح موجودات

[4] ترجمہ المیزان، ج13،ص:152

[5] ص،19-17: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﯯ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﯰ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ﯱ

[6] ملاحظہ ہو۔المیزان فی تفسیر القرآن، ج13،ص:121-120

[7] بحارالانوار ج 57 ص 169

[8] مطہری، مرتضی؛ آشنایی با قرآن، ج4،ص174۔

قرآن مجید کے سورہ نحل کی آیت نمبر ۴۸ میں کیوں شمائل کو جمع لایا گیا ہے جبکہ یمین کو مفرد لایا گیا ہے؟

سورہ نحل کی آیت نمبر ۴۸ میں آیا ہے:: اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ﴿۴۸﴾ میں نے تفسیر المیزان، تفسیر نمونہ اور تفسیر فیض الاسلام میں یہ جاننے کی کوشش کی کہ مذکورہ آیہ شریفہ میں کیوں شمائل جمع کی صورت میں آیا ہے جبکہ یمین مفرد آیا ہے، لیکن مجھے ان تفاسیر کی وضاحتیں مبہم لگیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر ممکن ہو تو مہربانی کر کے سادہ اور عام فہم الفاظ میں وضاحت کیجئے کہ اس آیہ شریفہ میں یمین و شمال سے مراد کیا ہے اور شمائل کیوں جمع کی صورت میں آیا ہے؟

مختصر جواب

اس آیہ شریفہ میں خداوند متعال اجسام کے سایوں کو اپنی عظمت کی نشانیوں کے عنوان سے تعارف کراتا ہے اور انہیں اپنے پروردگار کے لئے سجدہ کی حالت میں جانتا ہے۔ اجسام کے سائے ہماری زندگی میں ایک موثر رول رکھتے ہیں، جیسے: سورج کی روشنی، کرنوں اور حرارت کی تعدیل اجسام کو دیکھنے میں مدد وغیرہ۔

مفسرین نے لفظ شمائل کو جمع استعمال کرنے اور یمین کو مفرد استعمال کرنے کے

سلسلہ میں متعدد وجوہات بیان کئے ہیں کہ ہم تفصیلی جواب میں ان کی طرف اشارہ کریں گے۔

تفصیلی جوابات

اس آیہ شریفہ میں خداوند متعال، اجسام کے سایوں کی دائیں بائیں کی طرف حرکت کو اپنی عظمت کی نشانیوں کے عنوان سے بیان کرتا ہے اور انہیں اپنے پرور دگار کے لئے سجدہ، تواضع اور خضوع وخشوع کی حالت میں جانتا ہے۔

بیشک، اجسام کے سائے ہماری زندگی میں موثر رول ادا کرتے ہیں، ممکن ہے بہت سے لوگ اس سے غافل ہوں، اورقرآن مجید کا سایوں کے اس مسئلہ کو اہمیت دینا اسی نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے۔[1]

سائے اگر چہ عدم نور کے علاوہ کچھ نہیں ہیں، لیکن ان کے بہت سے فائدے ہیں جیسے:

۱۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی اوراس کی حیات بخش شعائیں مخلوقات کی زندگی اور ان کے نشو ونما کا سر چشمہ ہیں، سائے بھی نور کی کرنوں کی تعدیل میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ سورج کی یکساں تپش اگر ایک طولانی مدت تک جاری رہے، تو تمام چیزوں کو پژمردہ کر دیتی ہے اور انہیں جلا کر راکھ کر دیتی ہے، لیکن یہ سائے ہی ہیں جو سورج کی اس تپش کو معتدل اور موثر حد میں کنٹرول کرتے ہیں۔

۲۔عام تصور کے برعکس صرف نور ہی اشیاء کو دیکھنے کا سبب نہں ہے، بلکہ نور کو ہمیشہ سایوں اور نیم سایوں کے ہمراہ ہونا چاہئے، تا کہ اشیاء کا مشاہدہ متحقق ہو جائے، بہ الفاظ دیگر اگر کسی چیز کے اطراف میں نور یکساں صورت میں پڑتا رہے، اس طرح کہ کسی قسم کا سایہ یا نیم سایہ موجود نہ ہو، تو اس قسم کی چیزیں جو نور میں غرق ہوتی ہیں ہرگز دکھائی نہیں دیں گی۔

یعنی، جس طرح مطلق تاریکی میں کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے، اسی طرح مطلق نور میں بھی کوئی چیز قابل رویت نہیں ہوتی ہے، بلکہ اشیاء کو دیکھنا، نور اور ظلمت (روشنی اور سایہ) کی آمیختگی سے ہی ممکن ہے، اس لحاظ سے، اشیاء کے مشاہدہ اور ان کی ایک دوسرے سے تشخیص میں سایوں کا کلیدی اور موثر رول ہوتا ہے۔ (غور فرمایئے)

لیکن یہ کہ اس آیہ شریف میں کیوں یمین (دایاں) مفرد کی صورت میں اور شمائل (شمال یعنی بایان) جمع کی صورت میں آیا ہے۔ مفسرین نے اس کے کچھ وجوہات بیان کئے ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ اس تعبیر میں فرق شاید اس لئے ہو کہ سایہ، صبح کی ابتدا میں (جنوب کے نقطہ پر توجہ کرنے والوں کے لئے) دائیں طرف پڑتا ہے اور اس کے بعد مسلسل بائیں طرف حرکت کرتا ہے تا کہ غروب کے وقت مشرق کے افق پر محو ہوجائے، [2] پس بائیں جانب سایوں کی کثرت معنی رکھتی ہے۔

۳۔ یمین اگرچہ مفرد ہے لیکن بعض اوقات اس سے جمع کا ارادہ کیا جاتا ہے اور یہاں پر مراد جمع ہے۔ [3]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ: یہ جو خداوند متعال لفظ یمین کو مفرد صورت میں لایا ہے (اگر چہ اس سے مراد جمع ہے) لفظ کو خلاصہ اور مختصر کرنے کے لئے ہے اور یمین اس لفظ شئی کی طرف پلٹتا ہے جو جمع ہے، کیونکہ لفظ شئی سے جمع ارادہ کیا گیا ہے۔ [4]

۳۔ یمین کو مفرد لانا اور شمائل کو جمع لانا اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ یمین (دایاں) ایک کے معنی میں ہے، جبکہ شمال کی جہت زیادہ ہے، کیونکہ ہر چیز کا معنوی یمین اس کی وہی الٰہی جہت ہے، اور ہر چیز کا شمال اس کی خلقت کی جہت ہے اور وجہ الٰہی کی کثرت وحدت میں پائی جاتی ہے اور اس کی خلقت کی وجہ الٰہی کی وحدت، کثرت میں فانی ہوتی ہے [5]

حواشی

[1] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج11، ص: 254 (با اندکی تصرف)، نشر دار الکتب ال اِسلامیۃ، تہران، 1374 ه۔ش

[2] تفسیر قرطبی ذیل آیہ فوق.

[3] رازی، ابو الفتوح روض الجنان و روح الجنان فی تفسیر القرآن (تفسیر ابو الفتوح رازی)، ج12، ص: 45، نشر بنیاد پژوہشہا ی اسلامی آستان قدس رضوی، مشہد، 1408 ه۔

[4] بغدادی علاء الدین علی بن محمد، لباب الۃأ ویل فی معانی التنزیل، ج3، ص: 80، نشر دار الکتب العلمیۃ، بیروت،، 1415 ه ش

[5] خانی رضا۔ ریاضی، حشمت اللہ ترجمہ بیان السعادۃ، ج8، ص130، نشر مرکز چاپ و انتشارات دانشگاہ پیامنور، تہران، 1372 ه۔ش

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۵۴ کے مطابق اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو قیامت تک کفار پر برتری رکھتے ہیں، تو کیا ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو قبول کرنا چاہئے تا کہ قیامت تک تمام کفار سے برتر رہیں؟

خداوند متعال قرآن مجید کے سورہ آل عمران کی ایت نمبر ۵۴ میں ارشاد فرماتا ہے: میں نے قیامت تک تمہارے [عیسیٰ کے] پیرووں کو کفار پر برتری دی ہے۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کے پیرو قیامت تک تمام کفار پر برتر ہیں، تو کیوں ہم نے دین محمد (ص) کو اختیار کیا ہے؟ ہم حضرت عیسیٰؑ کے دین کو اختیار کرتے تا کہ قیامت تک تمام کفار پر برتر رہتے؟

مختصر جواب

مذکورہ سوال کے بارے میں مختلف جوابات اور نظریات پیش کئے گئے ہیں کہ ہم ان میں سے ذیل میں بعض کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

ا۔ حضرت عیسیٰؑ کے پیرووں سے مراد، امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور اس مطلب کے لئے تین وجوہات بیان کی گئی ہیں:

الف۔ کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عیسیٰؑ کے بعد ہے۔

ب۔ چونکہ ہمارے پیغمبر نے حضرت عیسی [ع] اوران کی کتاب کی تصدیق کی ہے اور جو دوسرے کی تصدیق کرے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کی متابعت کی ہے۔

ج۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت، توحید کے باب میں دوسرے انبیاء کے ساتھ متحد ہے کیونکہ یہ دین کی بنیاد ہے، اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے انبیاء کے متبع ہیں۔

۲۔آیہ شریفہ میں اتباع سے مراد حق کی پیروی ہے، پیرو وہ ہیں جنہیں خداوند متعال کی رضامندی حاصل ہے، پس جو تیری پیروی کرتے ہیں کی عبارت، ظہور اسلام سے پہلے تک عیسائیوں اور ظہور اسلام کے بعد اسلام پر استقامت کرنے والے افراد پر مشتمل ہے۔

۳۔زیر بحث آیہ شریفہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند متعال عیسائیوں کو یہودیوں پر برتری عطا کرے گا (یہ تفسیر ظاہر آیت کے زیادہ مطابق ہے)

۴۔اس (مجموعا) سے مراد عیسائی اور مسلمان ہے اور آیہ شریفہ یہ خبر دینا چاہتی ہے کہ یہود، قیامت تک ذلیل وخوار اور حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کو واجب جاننے والوں کے دباو میں رہیں گے۔

لیکن یہ کہ مسلمان کیوں حضرت عیسیٰؑ کی نسبت سے کفار میں شمار نہیں ہوتے ہیں وہ اس لئے ہے کہ یہاں پر کافر منکر کے معنی میں ہے اور یہ یہودی قوم ہے کہ جس نے حضرت عیسیٰؑ کا انکار کیا، لیکن مسلمان نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کا انکار نہیں کرتے ہیں اور ان کی نسبت سے کافر نہیں ہیں بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے توسط سے پیغمبر اسلام کی بعثت کی بشارت دینے کے حقیقی پیرو ہیں۔

مسلمان، حضرت عیسیٰؑ کو بڑے پیغمبروں میں سے، تیسرے اولوالعزم پیغمبر، صاحب

شریعت اور صاحب کتاب پیغمبر جانتے ہیں، اس بنا پر خداوند متعال جو فرماتا ہے کہ ہم تمہاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک کفار پر برتری دیں گے، بیشک یہاں پر کفار سے مراد مسلمان نہیں ہو سکتے ہیں کیونکہ اس لفظ کا کسی صورت میں مسلمانوں پر اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

تفصیلی جوابات

آپ کے سوال میں جو ترجمہ پیش کیا گیا ہے وہ اس آیہ شریفہ کے مطابق نہیں ہے ہم اس کا دقیق جواب دینے کے لئے پہلے اس آیہ شریفہ کا ترجمہ پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد مورد سوال آیت کی تفسیر سے استفادہ کر کے اس کا جواب دیں گے۔

آیت کا ترجمہ:

اور ہم تمہاری (عیسیٰ کی) پیروی کرنے والوں کو انکار کرنے والوں (کفار) پر قیامت تک کی برتری دینے والے ہیں، اس کے بعد تم سب کی بازگشت ہماری طرف ہوگی اور ہم تمہارے اختلافات کا صحیح فیصلہ کر دیں گے۔[1]

واضح اور دقیق جواب تک پہنچنے کے لئے چند مسائل کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ اس لئے ہم مندرجہ ذیل مباحث اور آیہ شریفہ کے ضمن میں مطلوبہ جواب تک پہنچ جائیں گے۔

سوال میں ذکر کی گئی آیہ شریفہ کے بارے میں، مختلف جوابات اور نظریات پیش کئے گئے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

ا۔ حضرت عیسیٰؑ کے پیرووں سے مراد، امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور اس مطلب کے لئے تین وجوہات بیان کی گئی ہیں:

الف۔ کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عیسیٰؑ کے بعد ہے۔

ب۔ چونکہ ہمارے پیغمبر نے حضرت عیسی [ع] اور ان کی کتاب کی تصدیق کی ہے

اور جو دوسرے کی تصدیق کرے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کی متابعت کی ہے۔

ج۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت، توحید کے باب میں دوسرے انبیاء کے ساتھ متحد ہے کیونکہ یہ دین کی بنیاد ہے، اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے انبیاء کے متبع ہیں۔[2]

۲۔آیہ شریفہ میں اتباع سے مراد حق کی پیروی ہے، پیرو وہ ہیں جنہیں خداوند متعال کی رضامندی حاصل ہے، پس جو تیری پیروی کرتے ہیں کی عبارت ظہور اسلام سے پہلے اور دین عیسیٰ کے منسوخ ہونے تک عیسائیت پر استوار افراد اور اس کے علاوہ ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جنہوں نے ظہور اسلام کے بعد اسلام کی پیروی میں استقامت کا مظاہرہ کیا ہے اور اس کے پابند رہے ہیں، چونکہ اسلام کی پیروی، حق کی پیروی ہے اور درنتیجہ حضرت مسیح کی پیروی ہے۔[3]

اس نظریہ کو علامہ طبا طبائی نے بعض مفسرین سے نسبت دے کر اس کی تنقید کی ہے۔[4]

۳۔زیر بحث آیہ شریفہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند متعال عیسائیوں [5] کو یہودیوں (یعنی جن کے اجداد حضرت عیسیٰ کی نسبت سے کافر ہوئے اور ان کے خلاف سازش کی) پر برتری عطا کرے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قوم یہود پر عذاب الٰہی نازل ہوگا اور عذاب الٰہی ان پر شدت اختیار کرے گا۔[6]

اسی تفسیر کی بنا پر، جو ظاہر آیت کے بھی مطابق ہے، یہ آیت ان معجزہ نما آیات میں سے ہے، جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے پیرو ہمیشہ یہودیوں سے برتر ہوں گے۔

ہم آج کی دنیا میں اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ یہود و صہیونیت، عیسائیوں سے وابستگی اور ان کی مدد کے بغیر اپنی سیاسی و اجتماعی زندگی کو ایک دن بھی جاری نہیں رکھ سکتے

ہیں۔[7]

اس نظریہ کے مطابق، حضرت عیسیٰؑ کے پیرووں سے مراد عیسائی ہیں، اس لحاظ سے ہم ہر جگہ اور ہر وقت یہودیوں کو عیسائیوں سے ذلیل تر دیکھتے ہیں اور اسی وجہ سے یہودیوں سے ملک و سلطنت چھین لی گئی ہے اور یہ عیسائیوں کے قبضہ میں ہے (یوروپ اور روم وغیرہ میں) اور عیسائی، یہودیوں سے عزیز تر ہیں اور قیامت تک ان پر برتر رہیں گے۔[8]

۴۔جملہ الذین اتبعوا (مجموعا سب) سے مراد عیسائی اور مسلمان ہیں اور آیہ شریفہ خبر دینا چاہتی ہے کہ یہود قیامت تک ذلیل و خوار اور حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کو واجب جاننے والوں کے زیر تسلط رہیں گے۔[9]

کیا مسلمان، حضرت عیسیٰؑ کی نسبت سے کافر ہیں؟ یہاں پر کافر سے مراد منکر ہے[10]، مسلمان نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلاتے نہیں ہیں اور ان کی نسبت سے کافر نہیں ہیں بلکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو عظیم پیغمبروں میں سے ایک، تیسرے اولوالعزم پیغمبر اور صاحب شریعت و صاحب کتاب پیغمبر جانتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: بچہ نے آواز دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔[11] لیکن یہ یہودی تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ (ع] کا انکار کیا اور انہیں قتل تک پہنچایا۔

اس بنا پر خداوند متعال جو یہ فرماتا ہے کہ میں نے قیامت تک تمہارے (عیسیٰ کے) پیرووں کو کفار پر برتری عطا کی ہے، بیشک کفار سے مراد مسلمان نہیں ہو سکتے ہیں اور اس لفظ کا کسی صورت میں مسلمانوں پر اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

اس بنا پر، جملہ الذین اتبعوا کے پیش نظر، اس میں حضرت عیسیٰؑ کے مجموعی پیروان شامل ہیں اور الذین اتبعوا کی عبارت کی تفسیر کے مطابق مسلمان بھی حضرت عیسیٰؑ کے پیرو شمار ہوتے ہیں، پس اس عبارت میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں اور اس طرح اس

آیہ شریفہ کے معنی یوں ہوتے ہیں: اور ہم تمہاری (عیسیٰ کی) پیروی کرنے والوں کا انکار کرنے والوں (کفار) پر قیامت تک برتری دینے والے ہیں، اس کے بعد تم سب کی باز گشت ہماری طرف ہوگی اور ہم تمہارے اختلافات کا صحیح فیصلہ کردیں گے۔

آخر پر، اس نکتہ کو بیان کرنا ضروری ہے کہ اگر ہم اس امر پر شک وشبہ سے دو چار ہوں کہ راہ حق پر چل کر ظاہرا شکست سے دو چار ہوجائیں یا یہ کہ باطل راہ پر چل کر بظاہر کامیاب ہوجائیں، تو پہلا انتخاب مناسب تر انتخاب ہوگا، چنانچہ امام حسینؑ نے بھی اسی چیز کا انتخاب کیا ہے۔ اس بنا پر اگر اسلام کی حقانیت ہمارے لئے مشخص ہوئی اور ہم صرف ظاہری کامیابی کے لئے، مسحیت کی طرف (آپ کے سوال کے استدلال کے مطابق) میلان پیدا کریں تو یہ فیصلہ منطقی نہیں ہوگا اور قرآن مجید کی دوسری آیات من جملہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۰ کے مطابق نہیں ہوگا۔

اس موضوع کے بارے میں مزید آگاہی حاصل کرنے کے سلسلہ میں آپ ہماری اسی سائٹ کے عنوان سرخاتمیت دین اسلام سوال: ۳۵۰۳ کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔

حواشی

[1] ترجمہ ذیشان حیدر جوادی

[2] طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، مترجمان، ج 4، ص 94، ناشر: انتشارات فراہانی، تہران، طبع اول، 1360 ہ ش.

[3] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 3، ص 326 و ج 3، ص 327، ناشر: دفتر انتشارات اسلامی جامعۃ مدرسین حوزہ علمیہ قم، قم، طبع: پنجم، 1374 ہ ش.

[4] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 3، ص 328 و 329.

[5] طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، مترجمان، ج 4، ص 94.

[6] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر،، ج 3، ص 330.

[7]، مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 2، ص 570، ناشر: دار الکتب ال إسلامیۃ، طبع تہران، طبع طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، مترجمان، ج 4، ص 94. اول، 1374 ش.

[8] طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، مترجمان، ج 4، ص 94.

[9] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 3، ص 330.

[10] فراہیدی خلیل بن احمد، کتاب العین، ج 5، ص 356، طبع دوم، انتشارات ہجرت، قم، 1410 ہ.

[11] مریم، 30.

خدا کے مکر کے کیا معنی ہیں؟

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۵۴ میں ارشاد ہوا ہے:۔۔۔ اور یہودیوں نے عیسیٰ سے مکاری کی تو اللہ نے بھی جوابی مکاری کی، خدا بہترین مکر کرنے والا ہے۔ کیا اس آیہ شریفہ میں خداوند متعال اپنی مکاری کے بارے میں فخر سے بات نہیں کرتا ہے؟ کیا مکاری ایک بری چیز نہیں ہے؟

مختصر جواب

عربی ادبیات میں مکر کے معنی کسی کو اس کی مراد سے روکنا ہے (خواہ یہ مراد اچھی ہو یا بری) اس معنی کی بنا پر مکر ہمیشہ اور ہر موقع پر بری چیز نہیں ہوتی ہے۔

اس لفظ کو خداوند متعال سے نسبت دینا نقصان دہ سازشوں کو ناکام بنانے کے معنی میں ہے، اور جب یہ لفظ مفسدین کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی اصلاحی پروگراموں میں رکاوٹ ڈالنا ہوتا ہے۔ زیر بحث آیہ شریفہ میں مکر کو خدا سے نسبت دینے کے معنی یہ ہیں کہ دشمن، یعنی عیسائی اپنے شیطانی منصوبوں کے ذریعہ اس الٰہی دعوت میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے تھے، لیکن خداوند متعال نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کے تحفظ اور دین کی ترقی کے لئے تدبیر کی اور دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا دیا۔

تفصیلی جوابات

اس آیہ شریفہ میں مکر الٰہی کی مراد کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عربی

ادبیات میں مکر الٰہی کے کیا معنی ہیں؟ ھ

عربی لغت میں مکر کا لفظ موجودہ فارسی ادبیات میں استعمال ہونے والے لفظ مکر سے کافی فرق رکھتا ہے۔ کیونکہ آج کل کی فارسی زبان میں مکر شیطانی اور نقصان دہ سازشوں کو کہا جاتا ہے، جبکہ عربی ادبیات میں ہر قسم کی چارہ اندیشی اور تدبیر کو مکر کہا جاتا ہے۔ مفردات راغب میں آیا ہے کہ: المکر صرف الغیر عمایقصد [1] مکر کے معنی کسی کو اس کی مراد سے روکنا ہے خواہ اس کی مراد اچھی ہو یا بری۔

اس بنا پر قرآن مجید میں استعمال ہوئے لفظ مکر کے وہ معنی نہیں ہیں، جو فارسی میں اس لفظ کے نقصان دہ شیطانی سازشوں کے معنی ہیں بلکہ عربی ادبیات میں یہ نقصان دہ سازشوں کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اچھی تدبیروں کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید میں کبھی ماکر لفظ خیر کے ساتھ بیان ہوا، جیسے: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ [2] خداوند متعال بہترین تدبیر کرنے والا ہے اور کبھی لفظ مکر لفظ سیئ کے ساتھ آیا ہے، جیسے: وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ [3] برا نقشہ اور تدبیر کرنے والے کو ہی اس کا نقصان پہنچے گا

زیر بحث آیہ شریفہ میں مکر کو خداوند متعال سے نسبت دینے کے معنی یہ ہیں کہ دشمن، یعنی عیسائی اپنے شیطانی منصوبوں کے ذریعہ اس الٰہی دعوت میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے تھے، لیکن خداوند متعال نے اپنے پیغمبر [ص] کی جان کے تحفظ اور دین کی ترقی کے لئے تدبیر کی اور دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنادیا۔[4]

اس معنی کی بنا پر مکر ہمیشہ اور ہر موقع پر بری چیز نہیں ہوتی ہے۔

اس لفظ کو خداوند متعال سے نسبت دینا نقصان دہ سازشوں کو ناکام بنانے کے معنی میں ہے، اور جب یہ لفظ مفسدین کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی اصلاحی

پروگراموں میں رکاوٹ ڈالنا ہوتا ہے[5]

حواشی

[1] المفردات فی غریب قرآن،ص:۲۷۷

[2] آل عمران، ۵۴

[3] فاطر، ۴۳

[4] تفسیر نمونہ، ج۲،ص: ۵۶۷و۵۶۶

[5] تفسیر نمونہ، ج۱۵،ص:۴۹۸

کونسی چیز حضرت مریمؑ کی عظمت کا سبب بنی ہے؟

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۴۲ میں ارشاد ہوتا ہے: اور اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ نے مریم کو آواز دی کہ خدا نے تمہیں چن لیا ہے اور پاکیزہ بنادیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں برتری عطا کی ہے ان کی برتری کس وجہ سے ہے؟ کیا انہوں نے انسانیت کے لئے کوئی خدمت کی ہے یا صرف عبادت اور تقوی میں دنیا کی دوسری عورتوں سے برتر تھیں؟ حضرت عیسیٰؑ کی داستان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے الٰہی پہلے سے ہی معین ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے نیک صفتوں کو حاصل کرنے کے لئے ذاتی طور پر کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ ورنہ جس بچے نے گہوارہ میں پیغمبری کا دعویٰ کیا، اس نے کب اپنی تربیت کے لئے وقت صرف کیا ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید اور احادیث میں آیا ہے کہ مریم بنت عمران، ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئی ہیں، ان کا خاندان مالی لحاظ سے کمزور ہونے کی وجہ سے ان کی پرورش کی طاقت نہیں رکھتا تھا(کیونکہ ان کے والد ان کی پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے تھے) اس لئے ان کی سرپرستی کو حضرت زکریا (حضرت مریم کے خالو) نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس عظیم خاتون کی زندگی سختیوں، زحمتوں اور محرومیتوں میں گزری ہے، کیونکہ وہ اپنی ماں کی نذر کے مطابق بچپن سے ہی معبد کی خادمہ کے عنوان سے فریضہ انجام دیتی تھیں اور اس عبادت خانہ میں اس کم سن

بچی کو نا قابل برداشت ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں اور وہ تمام مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتی تھیں اور کسی قسم کی شکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں۔ اس کے علاوہ خودغرض اور بے ایمان افراد کی طرف سے طعنہ زنیوں اور تہمتوں کو بھی صبر و تحمل سے برداشت کرتی تھیں اور خداوند متعال ان سے مکمل طور پر راضی تھا۔ خداوند متعال نے اس خاتون کی اس عظمت، صبر، رضامندی اور اطاعت محض کی وجہ سے انہیں یہ مقام اور منزلت عطا کی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے گہوارہ میں گفتگو کرنے سے ان کی عظمت و منزلت معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ کی یہ گفتگو درحقیقت اپنی والدہ کی عصمت و پاکدامنی کے دفاع کے لئے تھی۔

چونکہ خداوند متعال حضرت عیسیٰؑ کی لیاقت، شائستگی اور خودسازی سے آگاہ تھا اور قبل از عمل جزا کے عنوان سے، یہ عظمت و منزلت انہیں عطا کی تھی اور انہیں اس مقام پر منصوب کیا تھا۔

تفصیلی جوابات

اس سوال کا جواب واضح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے حضرت مریمؑ کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالیں:

تاریخ، اسلامی احادیث اور مفسرین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حنۃ اور اشباع نامی دو بہنیں تھیں، ان میں سے پہلی، بنی اسرائیل کی ایک نمایاں شخصیت عمران کے عقد میں قرار پائی اور دوسری کو خدا کے پیغمبر حضرت زکریاؑ نے اپنی ہمسر کے عنوان سے منتخب کیا۔

سالہا سال تک عمران کی شریک حیات کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ ایک دن حنہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھیں، اس نے ایک پرندہ کو دیکھا جو اپنے بچوں کو کھانا کھلاتا تھا، مامتا کی اس محبت کا مشاہدہ کرنے پر اس خاتون کے دل میں اولاد کا عشق شعلہ ور ہوا اور صمیم

قلب سے بارگاہ الٰہی میں اپنے لئے ایک اولاد کے لئے دعا کی اور اس کے فورا بعد ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ حاملہ ہوئیں۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے عمران کو وحی بھیجدی تھی کہ اسے ایک ایسا بیٹا عطا کرے گا جو بابرکت ہوگا اور وہ لاعلاج مریضوں کا علاج کرے گا اور مردوں کو خدا کے حکم سے زندہ کرے گا، اور اسے پیغمبر کے عنوان سے بنی اسرائیل میں بھیج دیا جائے گا۔

انہوں نے یہ داستان اپنی شریک حیات کے سامنے بیان کی، جب وہ حاملہ ہوئیں، تو اس نے خیال کیا کہ وہ بیٹا وہی ہوگا جو اس کے شکم میں ہے اور وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اس کے شکم میں موجود بچہ مریم (اس بیٹے کی ماں) ہے اور اسی وجہ سے اس نے نذر کی کہ اس بیٹے کو خانہ خدا بیت المقدس کا خدمت گزار قرار دے گی۔ لیکن پیدائش کے وقت مشاہدہ کیا کہ وہ بیٹی ہے، یہاں پر وہ پریشان ہوئیں کہ ان حالات میں کیا کرے، بیت المقدس کے خدمت گزار لڑکوں سے چنے جاتے تھے اور کسی لڑکی کے اس عنوان سے منتخب ہونے کا سابقہ نہیں تھا۔

بعض افراد نے کہا کہ: عمران کی بیوی کا اس نذر کے لئے اقدام اس لئے تھا کہ عمران اس کی حاملگی کے دوران فوت ہو چکے تھے، ورنہ بعید تھا کہ وہ ایسی نذر کرتیں۔[1]

قرآن مجید کی آیات اور احادیث سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ مریم بنت عمران، ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئی ہیں، ان کا خاندان مالی لحاظ سے کمزور ہونے کی وجہ سے ان کی پرورش کی طاقت نہیں رکھتا تھا (کیونکہ ان کے والد ان کی پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے تھے) اس لئے ان کی سرپرستی کو حضرت زکریا (حضرت مریم کے خالو) نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس عظیم خاتون کی زندگی سختیوں، زحمتوں اور محرومیتوں میں گزری ہے، کیونکہ وہ اپنی ماں

کی نذر کے مطابق بچپن سے ہی معبد کی خادمہ کے عنوان سے فریضہ انجام دیتی تھیں اور اس عبادت خانہ میں اس کم سن بچی کو نا قابل برداشت ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں اور وہ تمام مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتی تھیں اور کسی قسم کی شکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں۔ اس کے علاوہ خودغرض اور بے ایمان افراد کی طرف سے طعنہ زنیوں اور تہمتوں کو بھی صبر و تحمل سے برداشت کرتی تھیں اور خداوند متعال ان سے مکمل طور پر راضی تھا۔ خداوند متعال نے ان خاتون کی اس عظمت، صبر، رضامندی اور اطاعت محض کی وجہ سے انہیں یہ مقام و منزلت عطا کیا ہے۔ [2] اور ان کے بارے میں فرمایا: اور اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ نے مریم کو آواز دی کہ خدا نے تمہیں چن لیا ہے اور پاکیزہ بنادیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں برتری عطا کی ہے [3]

البتہ، ان کی ان مخلصانہ کوششوں کے نتیجہ میں خداوند متعال نے انہیں اپنے زمانہ کی عورتوں پر برتری عطا کی۔ کیونکہ خداوند شاکر ہے اور اپنے بندوں کے مخلصانہ اور نیک اعمال کا اجر دیئے بغیر نہیں چھوڑتا ہے۔ قرآن مجید اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: جو مزید خیر کرے گا تو خدا اس کے عمل کا شاکر اور اس سے خوب واقف ہے [4] انسانوں کی، خدا کی طرف راہنمائی کرنے کے لئے اولوالعزم پیغمبروں کی تربیت اور اسی طرح حضرت مریمؑ کی پاک و سالم زندگی، جو ہر عصر و زمان کی عورتوں اور ماوں کی تربیت کرنے کے لئے بہترین نمونہ عمل ہے، یہ اس عظیم خاتون کی انسانی معاشرے کے لئے سب سے بڑی خدمت ہے جو کسی دوسری خدمت کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے سب سے بلندترین و بہترین خدمت انسان کی تربیت کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف ایک انسان کی صحیح معنوں میں خدمت کر کے معاشرہ کے حوالہ کرے تو، اس نے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے، چہ جائیکہ ایک ماں ایک عظیم الشان پیغمبر کی تربیت کرے جو لاکھوں انسانوں کی ہدایت کا

سبب بنے، کیا اس سے بڑھ کر کسی خدمت کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

اس بنا پر کیا یہ عظیم اور قابل قدر بشارت، حضرت مریمؑ کے تقوی و پرہیزگاری کے سائے میں زحمتوں اور طاقت فرسا کوششوں کے علاوہ کسی اور وجہ سے حاصل ہونا ممکن ہے؟ یہ آیہ شریفہ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ حضرت مریمؑ اپنے زمانہ میں عظیم ترین خاتون تھیں۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ خداوند متعال مخلصانہ اعمال کی جزا دیتا ہے، اگر چہ وہ عمل کم بھی ہو۔ با لفاظ دیگر پروردگار حکیم و مہربان کی بارگاہ میں کیفیت کی اہمیت ہے نہ کمیت کی۔

لیکن حضرت عیسیٰؑ کا اپنی پیدائش کی ابتدا میں گھوارہ کے اندر گفتگو کرنا اگر چہ ایک عظیم معجزہ ہے کہ جس سے حضرت عیسیٰؑ کی عظمت اور مقام معلوم ہوتا ہے، لیکن در حقیقت یہ عظیم الٰہی معجزہ ان کی ماں کی عصمت و پاک دامنی کے دفاع میں تھا کہ حضرت مریم پر ناروا تہمتیں لگائی جاتی تھیں اور دشمن موجودہ قرائن وشواہد سے استفادہ کر کے (حضرت عیسیٰ کے تولد اور حضرت مریم کے بے شوہر ہونے سے) اور قرینہ حاصل کر کے اس معصوم بندہ الٰہی پر الزام لگاتے تھے۔ اگر وہ اس کام میں کامیاب ہوجاتے تو حضرت عیسیٰؑ کی نبوت داغدار ہوجاتی، مگر جس چیز نے ان جھوٹوں اور افوا بازوں کو ناکام بنا دیا وہ یہی عظیم معجزہ تھا۔ چنانچہ خداوند متعال نے زلیخا کی طرف سے حضرت یوسفؑ پر تہمتیں لگائے جانے کے قضیہ میں، اسی قسم کے ایک مشابہ معجزہ، یعنی ایک شیر خوار بچے کی گفتگو سے حضرت یوسفؑ کی پاک دامنی کی گواہی پیش کی اور ان کی پاک دامنی اور صداقت سے عام لوگ آگاہ ہوئے۔

حضرت عیسیٰؑ کی لیاقت و شائستگی اور خود سازی، مقام نبوت اور ہمدردانہ ہدایت و رہبری کو ثابت کرنے کے لئے یہ بہترین دلیل ہے۔ اور چونکہ خداوند متعال ان مسائل سے آگاہ تھا اس لئے قبل از عمل پاداش کے طور پر ان کے لئے یہ عنوان اور عصمت کا مقام عطا کیا اور انہیں اس مقام پر منصوب کیا۔

حواشی

[1]. مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج2، ص: 523، انتشارات دارالکتب اسلامیہ، تہران، 1376

[2] آل عمران، 37-35: إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُھَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَھَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

[3] آل عمران، 42: وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰۗىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰي نِسَاۗءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

[4]. بقرہ، 158: وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

ارادہ الٰہی کے، انسان کے لئے رحمت اور عذاب سے متعلق ہونے کے معنی کیا ہیں؟

سوال کی وضاحت:

قرآن مجید کے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۴ فرماتی ہے: اللہ ہی کے لئے زمین و آسمان کی کل کائنات ہے۔ تم اپنے دل کی باتوں کا اظہار کرو یا ان پر پردہ ڈالو وہ سب کا محاسبہ کرے گا۔ وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس پر چاہے گا عذاب کرے گا وہ ہر شے پر قدرت و اختیار رکھنے والا ہے۔ ہم نے قرآن مجید کی متعدد آیات میں مشاہدہ کیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ خداوند متعال جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جسے نہیں چاہتا، اسے گمراہ کرتا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۴ جیسی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری دنیا میں بھی خداوند متعال انسانوں کے بارے میں امتیازی سلوک سے کام لے گا۔ معلوم نہیں ہے کہ اس دنیا میں گمراہ لوگوں کو کس معیار کے مطابق بخش دیا جائے گا یا عذاب کیا جائے گا؟ البتہ یہ سب گمراہ شدہ افراد خدا کے ارادہ سے گمراہ ہوئے تھے۔ یہ آیتیں کیسے عدل الٰہی سے مطابقت رکھتی ہیں؟

مختصر جواب

قرآن مجید کی متعدد آیات میں بندوں کی عزت، ذلت، رزق، بخشش، سزا و جزا کا

سبب مشیت الٰہی بیان کیا گیا ہے، اور دوسری آیات میں ہدایت، عزت اور رزق کو تقوی و اخلاص کے ساتھ کار و کوشش سے منحصر جانا گیا ہے۔ ان دو قسموں کی آیات کے درمیان کسی قسم کی منافات نہیں پائی جاتی ہے بلکہ یہ ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ خداوند متعال کی مشیت اور ارادہ نا قابل تغیر حکمتوں اور عادلانہ قوانین کی بنیاد پر ہیں۔ پس مشیت الہی، یعنی اس کے اختیار اور حکیمانہ و نا قابل تغییر سنتوں کے مطابق حرکت ہے۔ اس معنی میں ارادہ نہ صرف خداوند متعال کی عدالت سے کسی قسم کی منافات نہیں رکھتی ہے بلکہ عین عدالت ہے۔

تفصیلی جوابات

قرآن مجید کی متعدد آیات میں انسان کی عزت، ذلت، رزق، بخشش سزا و جزا وغیرہ کے سلسلہ میں مشیت الٰہی کے رول کا ذکر کیا گیا ہے، من جملہ ان آیات میں سے آپ کی اشارہ شدہ آیہ شریفہ بھی ہے۔ اور یہ اس حالت میں ہے کہ خداوند متعال دوسری آیات میں ہدایت، عزت، سعادت، رزق و روزی کو حاصل کرنے کے لئے تقوی اور اخلاص کے ساتھ کام اور کوشش کو اصلی سبب قرار دیتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ قانون خلقت اور عقل کے حکم سے اور انبیائے الٰہی کی دعوت کے نتیجہ میں ہر شخص سعادت اور خوشبختی، عزت، ذلت کو حاصل کرنے کے لئے تلاش و کوشش کرنے میں مختار اور آزاد ہے۔ بہ الفاظ دیگر، بہشت قیمت ادا کرنے پر ملتی ہے نہ کہ کسی بہانہ سے، پس مذکورہ آیہ شریفہ میں ان سب چیزوں کو کیسے خداوند متعال سے نسبت دی گئی ہے؟

لیکن خداوند متعال کی مشیت اور اس کا ارادہ حکمتوں اور نا قابل تغیر عادلانہ قوانین پر مبنی ہے، کیونکہ خدوند متعال نے اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کے لئے کچھ اسباب وعوامل کو پیدا کیا ہے، اور ان اسباب کے آثار سے استفادہ کرنا ہی مشیت الٰہی ہے۔ پس مشیت الٰہی، یعنی خدا کے حکیمانہ اور نا قابل تغیر قوانین کے مطابق قدم بڑھانا ہے۔

اس مقدمہ کے پیش نظر ظاہر ہوتا ہے کہ بعض افراد کو جزا دینے میں مشیت الٰہی، امتیازی سلوک کے معنی میں نہیں ہے اور اس کی عدالت کے ساتھ اس کی مشیت کی کوئی منافات نہیں ہے، بلکہ اس کی مشیت عین عدالت ہے، کیونکہ، خداوند متعال کی طرف سے افراد کی عزت، ذلت، ہدایت و گمراہی، فقر، دولت اور رزق وغیرہ کو اپنی مشیت سے نسبت دینے کا سبب یہ ہے کہ عالم خلقت اور تمام نعمتوں اور انسان کی قدرت کا اصلی سرچشمہ خداوند متعال ہے۔ وہی، عزت اور خوشبختی حاصل کرنے کے لئے امکانات کو انسان کے اختیار میں دیتا ہے اور اسی نے اس عالم میں قوانین وضع کئے ہیں کہ اگر ان کی رعایت نہ کی جائے تو اس کا نتیجہ ذلت ہوگا اور اسی وجہ سے ان سب چیزوں کو اسی سے نسبت دی جاسکتی ہے، لیکن یہ نسبت انسان کی آزادی اور اختیار سے منافات نہیں رکھتی ہے، کیونکہ یہ انسان ہے جو آزادی و اختیار سے ان قوانین اور نعمتوں اور طاقت سے جائز یا ناجائز استفادہ کرتا ہے۔[1] مندرجہ بالا توضیحات کے پیش نظر ہم ایک بار پھر مذکورہ آیہ شریفہ کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں۔ خداوند متعال اس آیہ شریفہ میں ارشاد فرماتا ہے: اللہ ہی کے لئے زمین و آسمان کی کل کائنات ہے۔ (اس لحاظ سے) تم اپنے دل کی باتوں کا اظہار کرو یا ان پر پردہ ڈالو وہ سب کا محاسبہ کرے گا۔ وہ جس کو چاہے گا یعنی جس میں شائستگی ہو اسے بخش دے گا اور جس پر چاہے گا (یعنی جو مستحق ہوگا) عذاب کرے گا وہ ہر شے پر قدرت و اختیار رکھنے والا ہے۔[2]

اس آیت میں یا دوسری آیات میں بیان ہوئے جملہ من یشاء (جس کو چاہے گا) سے مراد، وہی حکمت کے ساتھ مشیت الٰہی ہے، یعنی جس کو بھی شائستہ اور مستحق جانے اسے اپنی مغفرت اور رحمت کے دائرہ میں قرار دیتا ہے اور جس کو عذاب کے لئے شائستہ و مستحق سمجھے اس پر عذاب کرے گا، کیونکہ خداوند متعال کا ارادہ حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے بلکہ قابلیتوں اور استحقاق کے ہم آہنگ ہے اور حکیم کسی دلیل کے بغیر کوئی ارادہ نہیں کرتا ہے اور

حساب کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیتا ہے۔[3]

اس بنا پر، رحمت و عذاب الٰہی کا سبب، مشیت الٰہی جاننے والی آیات اور تقوی و اخلاص کے ساتھ تلاش و کوشش کے رحمت الٰہی تک پہنچنے کو سبب جاننے والی آیات کے درمیان کسی قسم کی منافات نہیں ہے بلکہ یہ آیات ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ ارادہ الٰہی، یعنی الٰہی سنتوں اور قوانین کے مطابق حرکت کرنا اور خدا کی طرف سے اسباب وعوامل میں رکھے گئے نتائج تک پہنچنا ہے۔

حواشی

[1] مکارم شیرازی ناصر، تفسیر نمونہ، ج2، ص:498، با اندکی تصرف، تفسیر نمونہ، نشر دار الکتب ال اسلامیۃ، تہران، 1374 ش، طبع اول

[2] بقرہ، 284: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۸۴

[3] تفسیر نمونہ، ج22، ص:92، با اندکی تصرف

فقیروں کے حق میں انفاق کرنے کا فلسفہ کیا ہے؟

قرآن مجید کی بہت سی آیات، من جملہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۴ میں انفاق کی دعوت دی گئی ہے اور ممکن ہے جنھوں نے اپنے مال سے انفاق نہ کیا ہو وہ جہنم کی آگ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ میں اس چیز کا منکر نہیں ہوں کہ دوسروں کی مدد کرنا ایک اچھا کام ہے ۔لیکن خداوند متعال نے مفلس شخص کو کیوں اس قدر دولت عطا نہیں کی ہے کہ وہ میرا محتاج نہ رہتا؟ یہ کیسی بات ہے کہ، جس چیز کو خدا نے عطا کرنے سے اجتناب کیا ہے، میں اس کی تلافی کروں، یعنی مجھے خداوند متعال سے زیادہ مہربان ہونا چاہئے ورنہ میری جگہ جہنم میں ہے؟

مختصر جواب

کبھی کہا جاتا ہے: کہ اگر فلاں شخص فقیر ہے تو ضرور اس نے کوئی ایسا کام انجام دیا ہے کہ خدا اسے فقیر رکھنا چاہتا ہے اور اگر ہم غنی ہیں تو ہم نے ضرور کوئی ایسا کام انجام دیا ہے کہ خداوند متعال نے ہم پر مہربانی کی ہے۔ اس بنا پر دوسروں کا فقیر ہونا اور ہمارا غنی ہونا کسی مصلحت اور حکمت کے بغیر نہیں ہے ۔ جبکہ انفاق کے سلسلہ میں حکم الٰہی متعدد حکمتوں اور فلسفوں پر مبنی ہوتا ہے، من جملہ:

۱۔ دولتمند افراد کا امتحان

۲۔ شدید دنیوی محبت سے انسانی دل کی رہائی۔

۳۔ انسان کے دل کو نرم کرنا

۴۔ خدا کی نعمتوں کا شکر بجالانا

۵۔ نعمتوں میں اضافہ

۶۔ روح و جان کو سکون بخشنا

۷۔ بلاوں اور بری موت سے بچنا

لیکن مذکورہ تمام آثار اس صورت میں ہیں کہ حلال اور جائز مال میں سے انفاق کیا جائے کہ خداوند اس کے علاوہ کسی انفاق کو قبول نہیں کرتا ہے اور برکت عطا نہیں کرتا ہے۔

تفصیلی جوابات

مذکورہ آیہ شریفہ میں قرآن مجید فرماتا ہے: اے ایمان والو؛ جو تمھیں رزق دیا گیا ہے اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس دن نہ تجارت ہوگی (کہ سزا کے بدلے میں سعادت ونجات کو خرید سکوگے) نہ دوستی کام ائے گی اور نہ سفارش۔ اور کافر ہی اصل میں ظالمین ہیں [1] یہ آیہ شریفہ مسلمانوں سے خطاب ہے اور اس میں ایک ایسی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو معاشرہ میں اتحاد و یکجہتی اور حکومت اور دفاع و جہاد کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

اس کے بعد اس کام کے اخروی آثار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو انسان کے لئے حساب کے دن نجات کا سبب بن جائیں گے اور اس کے برخلاف انفاق کو ترک کرنا اس دن گرفت کا سبب بن جائے گا۔[2]

آپ کے پیش کئے گئے سوال کے بارے میں قابل بیان ہے کہ اتفاق سے قرآن مجید نے اس سوال کو کفار کے قول سے نقل کیا ہے اور ان کی ایک ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اور جب کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے دیا ہے اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو تو یہ کفار، صاحبان ایمان سے طنزیہ طور پر کہتے ہیں کہ ہم انہیں کیوں

کھلائیں جنہیں خدا چاہتا تو خود ہی کھلا دیتا، تم لوگ تو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو۔[3]

بخیل افراد کی عامیانہ اور تنگ نظری پر مبنی منطق یہ ہے کہ وہ اپنے زعم میں زیادہ مال جمع کرنے کے لئے اور اپنے بخل کی توجیہ کرنے کے لئے کہتے ہیں: اگر فلان شخص فقیر ہے، تو اس نے ضرور کوئی ایسا کام انجام دیا ہے کہ خدا اسے فقیر رکھنا چاہتا ہے اور اگر ہم غنی ہیں تو ہم نے ضرور ایسا کوئی عمل انجام دیا ہے جس کی وجہ سے ہم پر خدا کی مہربانی ہوئی ہے، اس بنا پر نہ ان کا فقر اور نہ ہمارا غنی ہونا بلا حکمت ہے۔

اگر خداوند متعال رزاق ہے، تو تم لوگ کیوں ہم سے چاہتے ہو کہ فقیروں کو ہم رزق دیں؟ اور اگر خدا نے چاہا ہے کہ وہ محروم رہیں، تو ہم ان کو کیوں بہرہ مند کریں جنہیں خداوند متعال نے محروم رکھا ہے؟

یہ لوگ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ انفاق کے سلسلہ میں حکم الٰہی متعدد حکمتوں اور فلسفوں پر مبنی ہوتا ہے، من جملہ:

۱۔ دولتمندوں کا امتحان: دنیا امتحان کا ایک ہال ہے، خداوند متعال ایک کا تنگدستی سے امتحان لیتا ہے اور دوسرے کا مال و دولت سے، کبھی ایک انسان کو دو زمانوں میں ان دونوں امتحانوں سے دوچار کرتا ہے، کہ کیا وہ فقر کے دوران امانتداری اور شکر گزاری کو بجالاتا ہے؟ یا سب چیزوں کو پامال کرتا ہے؟ اور غنی اور دولتمند ہونے کے دوران، جو کچھ اس کے اختیار میں ہوتا ہے وہ اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتا ہے یا نہیں؟

۲۔ شدید دنیوی محبت سے انسانی دل کی رہائی: اہل بیت اطہارؑ کی روایتوں میں، دنیا کی محبت کو تمام خطاوں اور گناہوں کا سرچشمہ شمار کیا گیا ہے۔[4] انفاق، اس نا مطلوب محبت کو نابود کرنے کا سبب ہے۔

۳۔ انسان کے دل کو نرم کرنا: نرم دلی، سنگ دلی کے مقابلے میں ہے۔ سنگ دلی

انسان کو انسانیت کے درجہ سے خارج کر دیتی ہے اور ممکن ہے اس حالت میں اس کے لئے گناہ کا مرتکب ہونا اور ظلم کرنا آسان ہو جائے۔لیکن اگر انسان فقیروں اور محتاجوں کی حاجت پوری کرنے کی طرف توجہ کرے اور ان کی زندگی کے بارے میں خود کو مسئول جانے تو وہ ایک ہمدرد اور مہربان دل رکھنے والا بن جائے گا۔

۴۔ خدا کی نعمتوں کا شکر بجالانا: انفاق، خدا کی نعمتوں کا شکرانہ ہے۔ خدا کی نعمتوں کا شکر بجالانا متعدد طریقوں سے حاصل ہوتا ہے، سب سے بہتر شکرانہ عملی شکرانہ ہے۔

۵۔نعمتوں میں اضافہ: خداوند متعال نے مومن اور باتقوی انسانوں کے انفاق کے بارے میں ضمانت دی ہے کہ ان کے انفاق کئے ہوئے مال کا کئی گنا، کبھی ہزاروں گنا اور کم از کم دس گنا مادی و معنوی عطایا عنایت کر کے تلافی کرے گا،[5] اور اس طرح انفاق کرنے والا شخص جب اس جوش و جذبہ کے ساتھ میدان میں قدم رکھے گا تو وہ سخی تر عمل کرے گا اور وہ کبھی کسی قسم کی کمی اور فقر کا احساس تک نہیں کرے گا، بلکہ خداوند متعال کا شکرانہ بجا لائے گا کہ خداوند متعال نے اسے اس قسم کی مفید اور منافع بخش تجارت عطا کی ہے۔

ایک مومن انسان نہ صرف مال میں کمی واقع ہونے اور فقر سے دوچار ہونے کا خوف نہیں رکھتا ہے، بلکہ وہ اطمینان رکھتا ہے کہ یہ کام ایک منافع بخش تجارت کے مانند ہے کہ اصل مال محفوظ رہنے کے علاوہ اس میں افزائش ہوگی اور منافع بھی حاصل ہوگا۔

٦۔انفاق، کی صداقت ایمان کی نشانی: ایمان کی قدر و منزلت اس کی صداقت میں مضمر ہے ورنہ جو ایمان صرف باتوں تک محدود ہو اور عمل کے مقام پر نہ ہو تو اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔قرآن مجید اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: صاحبان ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے اور پھر کبھی شک نہیں کیا اور اس کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد بھی کیا، درحقیقت یہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے

ہیں۔[6]

۷۔ روح و جان کا سکون: عام طور پر نیک اعمال اور خاص طور پر انفاق، روح و جان سکون کا سبب بنتا ہے آرام وسکون حاصل ہونے کے سلسلہ میں انفاق کے رول کے بارے میں اس آیہ شریفہ سے استناد کیا جاسکتا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ اپنے اموال کو راہ خدا میں رات میں، دن میں خاموشی سے اور علی الاعلان خرچ کرتے ہیں، ان کے لئے پیش پروردگار اجر بھی ہے اور انہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ حزن۔[7]

۸۔ بلاوں اور بری موت سے بچنا: بلاوں اور بری موت سے بچنا، انفاق کے اثرات میں سے ہے، اس موضوع کی طرف روایات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ امام باقرؑ فرماتے ہیں: صدقہ ۷۰ بلاوں اور بری موت کو دور کرتا ہے، کیونکہ صدقہ دینے والا ہرگز بری موت کے ذریعہ اس دنیا سے رخصت نہیں ہوگا۔[8]

اس بنا پر، اگر چہ تکوینی نظام کے مطابق خداوند متعال نے زمین کو اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے، اور انہیں اپنے کمال کی راہ کو طے کرنے میں آزاد رکھا ہے۔ اور اس میں ایسی جبلتیں پیدا کی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اسے ایک طرف کھینچتی ہے۔ خداوند متعال نے اپنے تشریعی نظام میں ان جبلتوں کو جان نثاری، فداکاری اور درگزر و انفاق کے ذریعہ کنٹرول کرنے، تہذیب نفس، اور انسانوں کی تربیت کرنے کے لئے کچھ قوانین مقرر کئے ہیں تا کہ انسان کو اس طریقہ سے خلیفہ الٰہی کے مقام تک پہنچا دے، جس کی اس میں استعداد پائی جاتی ہے، زکوۃ کے ذریعہ نفسوں کی تطہیر کرتا ہے، اور انفاق کے ذریعہ دلوں میں سے بخل کو دور کرتا ہے، اور طبقاتی فاصلوں کو دور کرتا ہے جو انسان کی زندگی میں ہزاروں فساد برپا کرنے کا سرچشمہ ہے وغیرہ۔ اور بہ الفاظ دیگر خداوند متعال چاہتا ہے کہ انسان کو دنیا کے امور کی اصلاح کرنے کے سلسلہ میں ایک ذمہ داری سونپے تا کہ اس طریقہ

سے دنیا بھی کمال تک پہنچے اور انسان بھی۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ تمام آثار و نتائج اس صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں، جب حلال اور جائز مال سے انفاق کیا جائے، کیونکہ خداوند متعال اس کے علاوہ انفاق کو قبول نہیں کرتا ہے اور برکت عطا نہیں کرتا ہے۔

حواشی

[1] بقرہ، 254 يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٥٤﴾

[2] تفسیر نمونہ، ج2، ص: 258

[3] (وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٧﴾)

[4] کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی ج 2 ص 131،...حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ ...دار الکتب الاسلامیہ، 1365ھ.ش، تہران، 8جلدی

[5] حدید، 18: اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١٨﴾

[6] حجرات، 15: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿١٥﴾

[7] بقرہ، 274 اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٤﴾

[8] الکافی ج 4 ص 3، 7۔ عَلِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ ابْنِ أَبِي عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سِنَانٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عليه السلام يَقُولُ الصَّدَقَةُ بِالْيَدِ تَقِي مِيتَةَ السَّوْءِ وَ تَدْفَعُ سَبْعِينَ نَوْعاً مِنْ أَنْوَاعِ الْبَلَاءِ وَ ... الکافی ج 4 ص 3، 7۔ عَلِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ ابْنِ أَبِي عُمَيْرٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سِنَانٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عليه السلام يَقُولُ الصَّدَقَةُ بِالْيَدِ تَقِي مِيتَةَ السَّوْءِ وَ تَدْفَعُ سَبْعِينَ نَوْعاً مِنْ أَنْوَاعِ الْبَلَاءِ وَ ...

حضرت موسیٰؑ کے سانپ والے معجزہ کے بارے میں قرآن مجید میں دو تعبیریں بڑا سانپ اور چھوٹا سانپ، استعمال ہوئی ہیں۔ کیا یہ دو تعبیریں آپس میں متناقض نہیں ہیں؟

سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۰۷ اور سورہ شعرا کی آیت نمبر ۳۲ جو حضرت موسیٰؑ کی داستان کے بارے میں ہیں اور ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا ایک بڑے سانپ (ثعبان مبین) میں تبدیل ہوا، لیکن سورہ نمل کی آیت نمبر ۱۰ اور سورہ قصص کی ۳۱ ویں آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا ایک چھوٹے سانپ (کانہا جان) میں تبدیل ہوا۔ یہ تعارض کیسے قابل حل ہے؟

مختصر جواب

مذکورہ دو آیات کی آپس میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ بعض مفسرین کا عقیدہ ہے کہ، عصا کا (جان) میں تبدیل ہونا حضرت موسیٰؑ کی نبوت کے ابتدائی زمانہ سے متعلق ہے، جب وہ ابھی اس معجزہ کے لئے آمادگی نہیں رکھتے تھے اور حتی کہ قرآن مجید کی صراحت کے مطابق حضرت موسیٰؑ خوف و وحشت سے دوچار ہوئے اور سانپ کو دیکھ کر بھاگ گئے اور

جہاں پر عصا کو (ثعبان) کے عنوان سے متعارف کیا گیا ہے، وہ حضرت موسیٰ کی رسالت اور فرعون سے ملاقات کرنے کے زمانہ سے متعلق ہے اور یہ آیات ایک ہی نشست سے متعلق نہیں ہیں کہ سانپ کے بارے میں دو تعبیریں استعمال ہوئی ہوں۔ جاننا چاہئے کہ اگر یہ دو تعبیریں ایک ہی زمانہ سے متعلق بھی ہوتیں، پھر بھی ان میں تناقض نہیں ہوتا، کیونکہ ایک آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ عصا اژدہا (فاذا ہی ثعبان) میں تبدیل ہوا اور دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک چھوٹا اور تیز سانپ (کانہا جان) تھا اور عربی ادبیات سے واقفیت رکھنے والے افراد، ان دو کے درمیان فرق اور عدم تناقض کو بخوبی جانتے ہیں۔

تفصیلی جوابات

لغت میں جان پتلے اور تیز رفتار سانپ کو کہا جاتا ہے۔ ایک دوسری جگہ پر جان ایک غائب موجود کو کہتے ہیں۔ لہٰذا چھوٹے سانپوں کو جان کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس قسم کے سانپ دکھائی دیئے بغیر گھاس اور نالیوں میں سے گزرتے ہیں۔ اور لفظ ثعبان بڑے سانپوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے معجزہ کے بارے میں قرآن مجید می دونوں الفاظ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ شاید پہلی نظر میں، اس سانپ کی ثعبان اور جان سے توصیف کرنا متعارض دکھائی دے اور اسی وجہ سے، مفسرین قرآن نے اس تعارض کے شبہ کو دور کرنے کے لئے کچھ طریقے پیش کئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تفسیر میں آیا ہے: سورہ نمل کی آیت نمبر ۱۰ اور سورہ قصص کی آیت نمبر ۳۱ میں حضرت موسیٰ کے عصا کی جان سے تعبیر کی گئی ہے، یہ حضرت موسیٰ کی بعثت کے ابتدائی زمانہ سے متعلق ہے اور جہاں پر ثعبان کہا گیا ہے وہ حضرت موسیٰ کے فرعون سے ملاقات کے زمانہ سے متعلق ہے۔ گویا خداوند متعال ابتدا میں حضرت موسیٰ کو اس معجزہ کے بارے میں تدریجی طور پر آشنا کر رہا ہے اور پہلے مرحلہ میں سانپ کو چھوٹا اور بعد والے مرحلہ میں عظیم تر صورت میں ظاہر کرتا

ہے۔[1] اس توجیہ کی بنا پر، حضرت موسیٰ کا معجزہ دو مختلف مواقع پر دو مختلف تعبیرات میں ظاہر ہوا ہے۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ، اس قسم کی توجیہ کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اگر تمام آیات، صرف ایک ہی واقعہ سے متعلق ہوتیں، پھر بھی ان کے درمیان تناقض نہیں ہے، اس طرح کہ:

سورہ اعراف اور شعرا کی آیات، جن میں ثعبان کی تعبیر سے استفادہ کیا گیا ہے، ان میں فاذاہی کی عبارت سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، یعنی حضرت موسیٰ کا عصا اچانک ایک اژدہا اور عظیم الجثہ سانپ میں تبدیل ہوا، لیکن سورہ نمل اور سورہ قصص میں موجود آیات میں لفظ جان پایا جاتا ہے، اور ان میں فاذاہی کے جملہ سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ بیان نہیں کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کا عصا ایک چھوٹے اور تیز رفتار سانپ میں تبدیل ہوا، بلکہ اس کی جگہ پر کانہا کی عبارت سے استفادہ کیا گیا ہے، یعنی جب وہ سانپ معجزہ کی صورت میں اژدہا کی شکل اختیار کر کے چلنے لگا فلما راہا تہتز اس کی حرکت ایک تیز رفتار اور چھوٹے سانپ کی جیسی تھی۔ جبکہ بھاری اجسام کا تقاضا ہے کہ آہستہ حرکت کریں اور جس سانپ میں عظیم الجثہ اور تیز رفتار ہونے کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں وہ ایک بڑا معجزہ شمار ہوگا۔[2]

حواشی

[1] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 6، ص 283، دار الکتب الاسلامیۃ.

[2] طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان، ج 3 و 4، ص 705 و 706، دار المعرفہ، چ 8.

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴ کے پیش نظر کیا عورت بھی مردوں کے لئے مادیات کا ایک حصہ اور حقیر تھی اور حیوانوں کے زمرے میں شمار ہونی چاہیے؟

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴ میں دنیوی مظاہر سے محبت کرنے کی سرزنش کی گئی ہے اور اسے حقیر امور میں شمار کیا گیا۔ اسی آیہ شریفہ میں اس قسم کے مظاہر کی کچھ مثالیں پیش کی گئی ہیں، جن میں: عورت، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، تندرست گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں شامل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت بھی مردوں کے لئے مادیات کا ایک حصہ اور حقیر تھی اور وہ بھی حیوانوں کے زمرے میں شمار ہونی چاہئے؟

مختصر جواب

مقدمہ:

مذکورہ سوال کے جواب میں ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ، جو معنی آپ نے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴ سے لئے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، اگر آیہ شریفہ کے معنی پر غور کیا جائے، تو آپ کے پیش کئے گئے معنی کے علاوہ کچھ اور معنی نکلتے ہیں، آیہ شریفہ فرماتی ہے: لوگوں کے لئے خواہشات دنیا۔ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، تندرست گھوڑے یا

چوپائے، کھیتیاں، سب مزین اور آراستہ کردی گئی ہیں کہ یہی متاع دنیا ہے اور اللہ کے پاس بہترین انجام ہے۔[1] یہ آیہ شریفہ انسانوں کی زندگی کے تکوینی اور فطری امور میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہر ایک اپنی زندگی میں اپنے اہل و عیال، اولاد اور مال کی محبت رکھتا ہے۔ آیہ شریفہ بذات خود کوئی قابل مذمت امر بیان نہیں کرتی ہے بلکہ صرف انسان کی ایک قسم کی دنیوی دلچسپیوں کو بیان کرتی ہے۔ تفاسیر[2] کے مطابق یہاں پر، خداوند متعال نے ہی انسان کی فطرت میں عورتوں (بیویوں) اور اولاد اور مال کی محبت پیدا کی ہے کہ ان کے ذریعہ انسان کمال اور تربیت کی راہ پر چل پڑتا ہے اور انسانیت کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ سرانجام وہ اپنی دنیوی نعمتوں کو گنتا ہے لیکن یاد دہانی کراتا ہے کہ ان چیزوں سے دل نہ لگائیں اور خدا کی راہ میں جہاد کریں۔

مذکورہ آیت میں قرآن مجید ایک لطیف اور گہرے نکتہ کو بیان کرتا ہے۔ اپنی بیویوں (جنس مونث) سے محبت کرنے کے ضمن اپنے بیٹوں (جنس مذکر) سے محبت کرنا بھی بیان کرتا ہے، اس بنا پر آپ کا اعتراض جنس مذکر کے بارے میں بھی صحیح ہونا چاہئے۔ ان چند ناموں کے ایک ساتھ ذکر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ سب ایک ہی رتبہ پر ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ذاتی گاڑی میں سفر پر گیا، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے والدین، وہ اور حتی کہ اس کی ذاتی گاڑی ہم رتبہ ہیں؛

آیہ شریفہ کی تفسیر:

قرآن مجید کی آیات کی تفسیر کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ آیت کے ماقبل و مابعد کا بہت غور سے مطالعہ کرنا چاہئے تا کہ اس کے بارے میں ایک جامع تفسیر بیان کی جاسکے۔ مذکورہ آیت بھی ان ہی میں سے ہے، اس سے قبل والی آیتوں میں، کفار یا ان افراد کی بات تھی جنہوں نے اپنی زندگی کا اصلی مقصد، اولاد اور مال و ثروت کو قرار دیا تھا اور

یہ ان کے لئے غرور وتکبر کا سبب بنا تھا اور وہ محسوس کرتے تھے اس کے باوجود وہ ابدی ہیں اور انہیں خدا کی ضرورت نہیں ہے، حقیقت میں یہ آیہ شریفہ ان کی گزشتہ [مالی و اولاد کی] محبت کو مکمل کرنے والی ہے، کہ اے کافرو، دنیوی زینتوں، اپنی بیویوں، اولاد اور سونے اور چاندی سے وابستہ نہ رہو اور اپنے اصلی مقصد سے، جو درحقیقت پروردگار کی عبادت و اطاعت ہے، غافل نہ رہنا۔

اسی سلسلہ میں علامہ طباطبائی، تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں: یہ آیہ شریفہ اور اس کے بعد والی آیت، اس سے پہلی والی آیات کے مطالب کو بیان کرتے ہوئے تشریح کرتی ہے، کہ ارشاد فرمایا گیا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے اموال واولاد کچھ بھی کام آنے والے نہیں ہیں اور وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔[3]

اس آیہ شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ اپنے مال و اولاد کے ذریعہ خدا سے بے نیاز ہوسکتے ہیں، یہ آیہ شریفہ بیان کرتی ہے کہ اس تصور کا سبب، ان کا مادی میلانات اور لذات کے سلسلے میں فریب کھانا تھا کہ انہوں نے آخرت کے امور سے منقطع ہوکر دنیا کی طرف رخ کیا، اور اس طرح بہت اہم امور سے محروم ہوکر عارضی امور کو اپنایا۔ وہ غلط فہمی سے دوچار ہوکر نہ سمجھ سکے کہ مادی لذتیں ناپائیدار ہیں اور یہ خدا تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے اور یہ نیک انجام ہے۔[4]

حقیقت میں گزشتہ آیات، وسیع تر معنی میں انسان کو یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہیں، کہ اے انسان؛ ان نعمتوں سے مناسب استفادہ کرنا جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں اور خداوند متعال سے غفلت نہ کرنا اور ان نعمتوں کے ساتھ اس قدر وابستگی پیدا نہ کرنا جو تمہارے لئے غفلت وگمراہی کا سبب بن جائیں۔

حواشی

[1] آل عمران، 14.

[2] بابایی، احمد علی، برگزیدۃ تفسیر نمونہ، ج 1، ص 267.

[3] آل عمران، 10

[4] طباطبایی، محمد حسین، ترجمہ تفسیر المیزان، سید محمد باقر موسوی ہمدانی، ج 3، ص 148، دفتر انتشارات اسلامی جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، قم، 1374، ہ ش، 14 بس

محترم مہینوں میں جنگ کے بارے میں اسلام کا نظریہ کیا ہے؟

مختصر جواب

ہماری آیات وروایات کے مطابق، اسلام محترم مہینوں (ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں جنگ کو نہ صرف جائز نہیں جانتا ہے بلکہ ایک طرح سے ان کے بارے میں شدت سے بیان کرتا ہے کہ کوئی شخص ان مہینوں کے دوران جنگ کا ذہن میں خیال تک بھی پیدا نہ کر سکے، یہاں تک کہ مذکورہ آیہ شریفہ میں محترم مہینوں کے دوران جنگ کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے اور غیر عمدی قتل کے دیت کو بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ سب اسلام کی طرف سے محترم مہینوں کے احترام اور حرمت کی دلیل ہے۔ محترم مہینوں میں جنگ کا ممنوع ہونا یہاں تک ہے کہ سب لوگوں کو ان مہینوں کا احترام کرنا چاہئے، لیکن جہاں پر کچھ افراد مسلمانوں کے ان مہینوں کے بارے میں احترام سے نا جائز فائدہ اٹھا کر ان مہینوں کی حرمت کو پامال کر کے ہتھیار اٹھالیں، تو خداوند متعال نے حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کو بھی ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہونا چاہئے تا کہ ان کی جارحیت اور ظلم وستم کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

تفصیلی جوابات

محترم مہینوں سے مراد وہ مہینے ہیں جن کا، خداوند حکیم نے احترام کرنا مومنین کے

لئے واجب قرار دیا ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ سے ان مہینوں میں جنگ کرنا نا مناسب کام سمجھا جاتا رہا ہے ۔ یہ سنت اسلام کے ظہور تک عربوں میں ایک عملی سیرت کے عنوان سے قابل احترام شمار کی جاتی تھی، قرآن مجید نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے محترم مہینوں کے احترام کو ضروری سمجھا ہے۔ چنانچہ خدا وند متعال ارشاد فرماتا ہے: بیشک، مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک کتاب خدا میں اس دن سے بارہ ہے جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ۔ ان میں سے چار مہینے محترم ہیں اور یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے، لہٰذا خبر دار، ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرنا اور تمام مشرکین سے اسی طرح جہاد کرنا جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں اور یاد رکھنا کہ خدا صرف متقی اور پرہیز گار لوگوں کے ساتھ ہے۔[1] محترم مہینے عبارت ہیں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب ۔ ان مہینوں کا احترام ایک فلسفے اور فائدے پر مبنی ہے کہ اس میں جنگوں کے خاتمہ کے احتمال اور جنگ کرنے والوں کو غور و فکر کرنے کا موقع ملنے کے احتمال اور صلح و صفائی کی دعوت اور مناسک حج بجالانے اور تجارت وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

لیکن [2] اسلام محترم مہینوں (ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں جنگ کو نہ صرف جائز نہیں جانتا ہے بلکہ ایک طرح سے ان کے بارے میں شدت سے بیان کرتا ہے تاکہ کوئی شخص ان مہینوں کے دوران جنگ کا ذہن میں خیال تک بھی پیدا نہ کر سکے، یہاں تک کہ مذکورہ آیہ شریفہ میں محترم مہینوں کے دوران جنگ کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے اور غیر عمدی قتل کے دیہ کو بھی اضافہ کیا گیا ہے ۔[3]

چونکہ مشرکین مکہ اس مسئلہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر محترم مہینوں میں مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتے تھے(وہ خیال کرتے تھے، کہ مسلمان ان مہینوں میں مقابلہ نہیں کریں گے) اس لئے خداوند متعال نے حکم دیا کہ اگر انہوں نے محترم مہینوں میں اسلحہ اٹھایا، تو مسلمانوں کو ان کا

ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: شہر حرام کا جواب شہر حرام ہے۔[4]

یعنی اگر دشمنوں نے ان مہینوں کے احترام کو پامال کیا اور ان میں آپ کے ساتھ جنگ کی، تو آپ بھی مقابلہ مثل کا حق رکھتے ہیں۔ کیونکہ حرمتوں کا قصاص ہے۔[5]

اس بنا پر اگر چہ اسلام نے محترم مہینوں میں جنگ نہ کرنے کی سنت (جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے عربوں میں رائج تھی) کی تائید کی ہے، لیکن دشمنوں کی طرف سے اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے پیش نظر، اس قانون کے لئے ایک استثنا قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں اللہ نے فرمایا ہے: پیغمبر، یہ آپ سے محترم مہینوں کے جہاد کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ ان میں جنگ کرنا گناہ کبیرہ ہے اور راہ خدا سے روکنا خدا اور مسجدالحرام کی حرمت کا انکار ہے اور اہل مسجدالحرام کا وہاں سے نکال دینا خدا کی نگاہ میں جنگ سے بھی بدتر گناہ ہے[6]۔

اس کے بعد اضافہ کرتا ہے: اور فتنہ (لوگوں کو دین سے گمراہ کرنا) تو قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔

کیونکہ وہ انسان کے جسم پر ظلم ہے اور یہ انسان کی روح و جان اور اس کے ایمان پر ظلم ہے اس کے بعد سلسلہ کو یوں جاری رکھتا ہے کہ: مسلمانوں کو مشرکین کے گمراہ کن پروپیگنڈے کے اثر میں نہیں آنا چاہئے، کیونکہ وہ مسلسل تمہارے ساتھ جنگ کرتے تھے تاکہ تمہیں اپنے دین سے منحرف کرسکیں۔ پس ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور محترم مہینوں وغیرہ کے بارے میں ان کے وسوسوں پر توجہ نہ کرنا۔[7]

محترم مہینوں کا احترام ان لوگوں کے لئے ہے کہ وہ ان مہینوں کو محترم جانیں، لیکن جو لوگ مسجد الحرام کی حرمت، محترم مہینوں کی حرمت اور حلال و حرام کی حرمت کو پامال کرتے ہیں، ان کے لئے ان مہینوں کے احترام کی رعایت کرنا ضروری نہیں ہے اور ان کے ساتھ حتی

کہ محترم مہینوں اور مسجد الحرام میں بھی جنگ کرنی چاہئے تاکہ اس کے بعد محترم مہینوں کی حرمت کو پامال کرنے کا خیال تک بھی ان کے ذہنوں میں پیدا نہ ہو۔[8]

حواشی

[1]۔ توبہ،36: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۝۳۶

[2] بقرہ، 217.

[3] طوسی، تهذيب الأحكام، ج 10، ص 215، تهران: دار الكتب الاسلامية، 1365ھ. ش 16۔ بَابُ الْقَاتِلِ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحَرَمِ، 1۔ الْحُسَيْنُ بْنُ سَعِيدٍ عَنْ فَضَالَةَ بْنِ أَيُّوبَ عَنْ كُلَيْبِ بْنِ مُعَاوِيَةَ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ عليه السلام يَقُولُ مَنْ قَتَلَ فِي شَهْرٍ حَرَامٍ فَعَلَيْهِ دِيَةٌ وَ ثُلُثٌ و....

[4] بقرہ، 194.: تَعْلَمُوْنَ۝۲۱۶ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۲۱۷

[5] تفسیر نمونہ، 31 و 32.

[6] بقرہ، 217

[7] تفسیر نمونہ، ج 2، ص 111 و 112 و 113.

[8] أنوار العرفان فی تفسیر القرآن، ج 3، ص 557.

کیا نیابتی عبادتیں، عبادتوں کی سودا بازی نہیں ہے؟

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۳ میں روزہ کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ حکم اس لئے ہے کہ شائد تم اس طرح متقی بن جاؤ اور اسی سورہ کی آیہ شریفہ ۱۸۴ میں ہے: لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص مریض ہے یا سفر میں ہے تو اتنے ہی دن دوسرے زمانے میں رکھ لے گا اور جو لوگ صرف شدت اور مشقت کی بنا پر روزے نہیں رکھ سکتے ہیں وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اگر روزہ رکھنا پرہیز گار بنا سکتا ہے، تو ایک بھوکے کو کھانا کھلانا ہمیں کیسے پرہیز گاری تک نہیں پہنچا سکتا ہے؟ اس قسم کی آیت اس امر کا سبب بنی ہے کہ دین کے تاجر دین کے دوسرے امور کے بارے میں اپنے لئے نا معقول قوانین گھڑیں اور اس طرح اپنا الو سیدھا کر سکیں۔ مثال کے طور پر میت کا بڑا بیٹا اس کی نمازیں پڑھے اور اگر میت کا کوئی بیٹا نہ ہو، تو کسی سید کو پیسے دیکر اس کی قضا نمازوں کو پڑھوائیں۔ یا جو شخص حج کے سفر پر نہ جا سکتا ہو، وہ کسی شخص کو پیسے دیدے تا کہ وہ اس امر میں اس کا نائب بن کر حج بجا لائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کی عبادتوں کا اس شخص کو کیسے فیض پہنچ سکتا ہے، جس نے خود ان فرائض کو انجام نہیں دیا ہے؟ اس بنا پر کوئی بھی شخص اپنی نمازوں اور روزوں کی سودا بازی کر سکتا ہے۔ یا، حتی کہ دوگنے پیسے دے کر اس کے لئے زیادہ نمازیں پڑھائی جائیں اور اس دنیا میں اسے دوگنی بہشت کی حوریں ملیں؟

مختصر جواب

اصلی قوانین کے ذیل میں، بعض فرعی قوانین کا ہونا، ہر اس معاشرہ میں ایک قطعی امر ہے، جس میں قانون کا راج ہو۔ اصلی قانون کے ذیل میں فرعی قوانین کا ہونا، قانون کا نا جائز فائدہ اٹھانے کے لئے کھلی ڈھیل کے معنی میں نہیں ہے۔ نماز، روزہ اور حج جیسے فرائض، ہر شخص کو اپنی زندگی کے دوران بجا لانے چاہئیں تا کہ اس کی قید حیات کے دوران (اضطراری موارد کے علاوہ) اس کے یہ فرائض دوسروں تک منتقل نہ ہو جائیں اور ان اعمال کو ترک کرنے کی صورت میں، اس پر عذاب کیا جائے گا اور جو شخص اس دنیا میں مشکلات اور سختیوں کو برداشت کر کے اپنے اعمال و فرائض بجا لاتا ہے، وہ ہرگز اس شخص کے مانند نہیں ہے جس نے اپنی زندگی میں کسی عذر کے بغیر اپنے فرائض پر عمل نہ کیا ہو اور صرف اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے ان فرائض میں سے بعض کی تلافی کرتے ہیں۔ روزہ کے کفارہ کے بارے میں بھی قابل ذکر ہے کہ: بھوکوں اور محتاجوں کو کھانا کھلانا صرف اس کی نافرمانی کا کفارہ ہے اور اصل روزہ کو بجا لانا، بدستور اس کے ذمہ باقی ہے اور اگر اس کے مرنے کے بعد کوئی رقم ادا کی جائے تا کہ اس کے قضا شدہ روزے اور نمازیں بجا لائی جائیں، تو یہ عمل اس کے عبادی اعمال میں سے صرف بعض مصلحتوں کو بجا لانا ہے، نہ کہ سب کے سب۔ اس بنا پر پیسے دیکر کسی کی نماز یا روزوں کو نہیں خریدا جا سکتا ہے کہ وہ ان سے بے نیاز ہو جائے۔

تفصیلی جوابات

قوانین پر عمل کرنے کے سلسلہ میں لوگ تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

ا۔ وہ لوگ جو طبیعی حالت میں ہوتے ہیں اور اصل قانون پر عمل کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ عام طور سے معاشرہ کی اکثریت اسی قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور بنیادی طور پر معاشرہ کے ایسے ہی لوگوں کے لئے قانون بنایا جاتا ہے

۔ اسلام کے الٰہی قوانین اور انسانی معاشرہ کے قوانین بھی اسی فضا میں بنائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر، ٹریفک کے قوانین، معاشرہ میں ٹریفک کی سہولیات فراہم کرنے کے لئے، معاشرہ کی غالب اکثریت کو مدنظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں۔

۲۔ جو افراد قانون کے بارے میں طبیعی اور معمول کی حالت نہیں رکھتے ہیں اور خاص حالات کے پیش نظر اصل قانون پر عمل نہیں کر سکتے ہیں، عام طور پر قانون ساز ایسے افراد کے لئے اصلی قانون کے بعد فرعی قانون کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹریفک کی ریڈ لائٹ سے نہ گزرنا ایک عام قانون ہے لیکن خاص حالات میں فائر برگیڈ اور ایمبولینسوں کے لئے اس قانون کی رعایت کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ اسلامی قوانین میں بھی معاشرہ کے دوسرے قوانین کے مانند استثنآت پائے جاتے ہیں۔ یہ استثنآت ان افراد کے لئے ہوتے ہیں جن کی طرف سے قانون کی رعایت نہ کرنے کی وجہ اس قانون کی نافرمانی نہیں ہوتی ہے۔

خداوند متعال نے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ پس روزہ رکھنا مسلمانوں کی زندگی کے قوانین میں سے ایک قانون ہے۔ لیکن قطعی طور پر بعض افراد ایسے ہیں، جو کسی نہ کسی (بیماری، مسافرت، شدید جسمانی ناتوانی کی) وجہ سے اس قانون پر عمل نہیں کرسکتے ہیں۔ اسلامی قانون کی رو سے ایسے افراد کے لئے روزہ رکھنا معاف کیا گیا ہے اور ان کے لئے اس کی تلافی کرنے والا قانون معین کیا گیا ہے۔ ماہ رمضان میں مسافرت پر جانے والوں کا بعد میں روزوں کی قضا بجالانا ان ہی قوانین میں سے ہے۔ یا ان افراد کے مانند کہ جن کی نماز، مسافرت کے دوران عام حالت سے نکل کر قصر نماز میں تبدیل ہوتی ہے۔ یا ان افراد کے مانند جو ایک ایسے وقت پر مالی لحاظ سے مستطیع ہوتے ہیں، جب بوڑھاپے یا لاعلاج بیماری کی وجہ سے واجب حج کو بجا نہیں لا سکتے ہیں (یعنی ان میں بدن کی استطاعت نہیں ہوتی ہے) اس قسم کے افراد اپنے لئے نائب لے سکتے ہیں۔ دونوں قوانین، یعنی اصلی قانون یا فرعی و

متبادل قانون پر عمل کرنا خداوند متعال کے حکم پر عمل کرنے کے مترادف ہے ایک فرض شناس مومن کے لئے اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ جو افراد طبیعی اور نارمل حالات میں ہوں اور مضطر و معذور نہ ہوں، لیکن قانون کی نافرمانی کر کے اس پر عمل نہیں کرتے ہیں، عام طور پر قانون ساز نے ایسے افراد کے لئے تلافی کرنے والا قانون معین کیا ہے، لیکن یہ قانون ویسا قانون نہیں ہے، جو معذور و مضطر افراد کے لئے بنایا گیا ہے، بلکہ یہ قانون ایسا قانون ہوتا ہے، جس میں تنبیہ اور جرمانہ کا پہلو ہوتا ہے۔ اس قسم کے قوانین کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہوتی ہیں:

الف) قانون شکنی کرنے والے پر سنگین تر و بیشتر فریضہ عائد کیا جاتا ہے۔

ب) مکلف تلافی کرنے کے باوجود اپنے فریضہ کی تمام مصلحتوں اور نتائج کو حاصل نہیں کرتا ہے۔

انسانی قوانین میں اس کی مثالیں کافی ملتی ہیں۔ اگر کوئی شخص عام اور نارمل حالات میں ریڈ لایٹ عبور کرے، تو اس کے لئے قانون نے سخت سزا کو مدنظر رکھا ہے۔ اسلامی قوانین میں بھی کفارات کی بحث میں یہی حالت ہوتی ہے۔[1] اگر کوئی شخص عام حالات میں اپنے فریضہ پر عمل نہ کرے، تو قانون نے اس کے لئے کچھ سزائیں معین کی ہیں جو مختلف حالات کے مطابق مختلف نوعیت کی ہیں۔ مثال کے طور پر جو شخص عمداً نماز کو ترک کرے، اس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے[2] اس کے علاوہ اس کے لئے اس کی قضاء بجالانا ضروری ہے۔ اور اگر کسی شخص نے رمضان المبارک کے روزے عمداً نہ رکھے ہوں، اس نے گناہ کیا ہے، اس کے علاوہ اسے ہر دن کے لئے ایک بندہ آزاد کرنا ضروری ہے یا دو مہینے روزہ رکھے، یا ساٹھ مسکینوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلائے، یا ہر مسکین کو ایک مد طعام (تقریباً ایک کلو) یعنی گندم یا جو یا اس کے مانند دیدے، [3] اور اس کے علاوہ جو روزہ نہیں رکھا ہے، اسے بھی قضا کے طور پر رکھے۔ اس قسم کا

شخص کسی صورت میں اس شخص کے مانند نہیں ہوسکتا ہے، جس نے اطاعت و بندگی کے طور پر اپنے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اس قسم کے افراد کی سب سے بڑی مشکل پروردگار عالم کے احکام کے مقابلے میں جرآت و جسارت اور عدم خضوع ہے۔ بالکل اس شخص کے مانند جو انسانی قوانین کی نافرمانی کر کے ریڈ لائٹ عبور کرتا ہے، اس پر اس کے لئے جرمانہ کیا جاتا ہے اور اس جرمانہ کی وجہ سے، اگر چہ کوئی دوسری سزا نہیں دی جاتی ہے، لیکن عام لوگوں اور قانون کی نظروں میں قانون شکن شمار ہوتا ہے۔ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی وہ نمازیں اور روزے بجالانا، جس نے ان اعمال کو عمدا ترک کیا ہو، بھی اسی قسم کا ہے۔ فرض کریں ایک شخص کے اعمال اس کے مرنے کے بعد بجا لائے جائیں، یا کسی شخص کو اجرت دے کر اس کی نیت سے اعمال کو انجام دلائیں، تو کیا متوفی نماز کے مانند اعمال کے تمام منافع و مصلحتوں تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا اس کی حالت اس شخص کے مانند ہوگی، جو اپنی زندگی میں اپنے اعمال کو بندگی کے عنوان سے بجالایا ہو؟ اگر چہ متوفی کے اعمال کو نیابت میں انجام دلانے سے متوفی اس کے بعض منافع اور مصلحتوں تک پہنچ سکتا ہے، لیکن یہ اسی جرمانہ کے مانند سزا ہے، جو انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں، مجرم کے لئے معین ہوتی ہے اور یہ ہرگز اعمال کی خرید و فروخت کے معنی میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جرمانے کچھ اور مصلحتوں کو حاصل کرنے کی غرض ہوتے ہیں۔

نتیجه

الف) مذکورہ تقسیم بندی کے پیش نظر، جو انسان عام اور نارمل حالات میں ہوتے ہیں، اگر اپنے فرائض نبھانے میں پہلوتہی سے کام لیں، تو اس مرحلہ میں ہرگز یہ لوگ ان افراد کے درجہ پر نہیں ہیں جنہوں نے خدا کے احکام کو اچھی طرح انجام دیا ہے۔

ب) نماز، روزہ اور حج جیسے اعمال اور فرائض کو ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنی زندگی کے دوران بجا لائے اور جب تک وہ زندہ ہے اس کے یہ اعمال و فرائض (حج کے

بارے میں مذکورہ اضطراری حالت کے علاوہ)[4] دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں ہوتے ہیں اور ان اعمال کو عمداً ترک کرنے کی صورت میں، گونا گوں سزاؤں کا مستحق ہوتا ہے۔ پس مکلف کی زندگی میں اعمال خریدنے کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

ج) روزہ کے مانند، بعض اعمال اگر عمدا ترک کئے جائیں، تو خود اس عمل کو دہرانے کے علاوہ اس کا کفارہ بھی بجالانا ہوتا ہے۔ بھوکوں اور حاجتمندوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلانا، صرف اس کی نافرمانی کا کفارہ ہے، اور اصلی روزہ بجا لانا بدستور اس کے ذمہ ہے۔ اس بنا پر چاہے جس قدر بھی انسان مال دار اور پیسے والا ہو، روزہ اور نمازوں کو خرید نہیں سکتا ہے۔

د) جن اعمال کو کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی نیابت میں بجا لایا جاتا ہے، اس کے بارے میں چند نکتے قابل ذکر ہیں: اولا: یہ کہ اس قسم کا شخص ہرگز اس شخص کے مانند نہیں ہے، جو خدا کی اطاعت کے طور پر ان اعمال کو اپنی زندگی میں بجا لایا ہو۔[5] ثانیا: یہ کہ اس قسم کا شخص اس کے بعض اعمال کو (اس کی موت کے بعد) نیابت میں انجام دینے سے اس عمل کے تمام منافع و مصلحتوں تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا ہے۔ ثالثا: یہ کہ یہ تلافی اسی جرمانے کے مانند ہے، جو انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں کسی شخص کے لئے معین کیا جاتا ہے اور یہ ہرگز اعمال کے خرید و فروخت کے معنی میں نہیں ہے۔

اس بنا پر، اصلی قوانین کے ذیل میں بعض فرعی اور متبادل قوانین کا ہونا قانون پر مبنی ہر معاشرے میں ہر قانون ساز کے مدنظر ہونا قطعی ہے۔ اس قسم کے قوانین کا ہونا قانون سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے معنی میں نہیں ہے۔ جو افراد غیر عمد طور پر اور کچھ غیر معمولی حالات کی وجہ سے اپنا فریضہ انجام نہیں دیتے ہیں، وہ ہر قانون کے لحاظ سے معذور ہیں، پس اگر کوئی شخص کسی قبل قبول دلیل کی بنا پر کسی مدت تک روزے نہ رکھ سکا اور اسی دوران فوت ہو گیا تو وہ ان افراد کے مانند ہے، جنہوں نے اپنے روزے قضا کئے ہیں، اس فریضہ کے عدم

انجام کی تلافی کچھ پیسے دے کر کرانا اور اس کے بدلے نیابت میں اس کے اعمال انجام دلانا کسی صورت میں عبادت کی سودا بازی نہیں ہے۔ کسی شخص کی قضا ہوئی نمازوں کو اس کے مرنے کے بعد نیابت میں بجا لانے کا مسئلہ بھی اسی کے مانند ہے۔ لیکن اگر مکلف نے اپنا فریضہ عمداً ترک کیا ہو، تو اس کی زندگی میں کسی کے ذریعہ ان اعمال کو بجا لانا جائز نہیں ہے اور اگر اس کے مرنے کے بعد ان اعمال کی تلافی کی جائے، تو یہ عمداً ترک کئے گئے اعمال کے گناہ بخش دیئے جانے کے معنی میں نہیں ہے۔ بہرحال اگر مکلف کی وفات کے بعد پیسے ادا کر کے اس کے قضا شدہ روزہ اور نمازیں بجا لائی جائیں، تو یہ صرف ان اعمال کی بعض مصلحتوں کو حاصل کرنا ہے نہ کہ سب منافع اور اس بنا پر کسی کے پاس چاہے جس قدر بھی پیسے ہوں وہ نماز یا روزوں کو خرید نہیں سکتا ہے اور ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے۔

حواشی

[1] سمیت الکَفّاراتُ کفّاراتٍ لأنہا تُکَفِّرُ الذنوبَ أي تسترھا (کفارہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ گناہوں کو چھپاتا ہے اور ان کی تلافی کرتا ہے) ملاحظہ ہو: لسان العرب، ج ۵، ص: ۱۴۸۔

[2] ملاحظہ ہو: الکافی ج،3 ص 267، بَابُ مَنْ حَافَظَ عَلَى صَلَاتِهِ أَوْ ضَيَّعَهَا.

[3] توضیح المسائل (المحشی للإمام الخمینی)، ج1، ص: 928.

[4] لوامع صاحبقرانی، ج8، ص: 82، انّ امیر المؤمنین صلوات اللّٰہ علیہ امر شیخا کبیرا لم یحجّ قطّ ولم یطق الحجّ لکبرہ ان یجھّز رجلا یحجّ عنہ).

[5] خداوند متعال سورہ حدید کی آیت نمبر ۱۰ میں سختی اور مشکلات میں انفاق کرنے والوں اور آرام و آسائش میں انفاق کرنے والوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: اور تم میں سے فتح سے پہلے انفاق کرنے والا اور جہاد کرنے والا اس کے جیسا نہیں ہوسکتا ہے جو فتح کے بعد انفاق اور جہاد کرے۔ پہلے جہاد کرنے والے کا درجہ بہت بلند ہے اگر چہ خدا نے سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور وہ تمہارے جملہ اعمال سے باخبر ہے۔

کیا بنی اسرائیل کے ذریعہ گائے کو ذبح کرنے کے بارے میں، خداوند متعال مقتول کو ایک قربانی کی درخواست کے بغیر زندہ نہیں کرسکتا تھا؟

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ٦٦ سے ٧٣ تک سب آیتیں قربان ہونے والی گائے کی کیفیت کے بارے میں ہیں جس کو ذبح کرنے کا خداوند متعال نے حکم دیا تھا۔ کیا اس گائے کا رنگ، بوڑھاپا، جوانی، چاق و چوبند ہونا اور لاغر ہونا خدا کے لئے کوئی اہمیت رکھتا ہے؟ کیا خداوند متعال مقتول کو ایک قربانی کی درخواست کے بغیر زندہ نہیں کرسکتا تھا؟ اور اگر یہ گائے زرد نہ ہوتی، لاغر ہوتی اور بوڑھی ہوتی تو خدا کی قدرت کو کیا نقصان پہنچا سکتی؟ اصلاح خداوند متعال کو قربانی کا تقاضا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

مختصر جواب

بنیادی طور پر حکیم و دانا شخص بیہودہ کام انجام نہیں دیتا ہے، اس لحاظ سے شیعوں کا اعتقاد ہے کہ صاحب شریعت سے صادر ہونے والے تمام کام مصلحتوں اور مقاصد کے تابع ہیں، اس بنا پر اس امر (گائے کی قربانی) میں بھی ضرور کوئی حکمت مضمر ہوگی، اگر چہ ہم اس کے بارے میں علم نہیں رکھتے ہیں۔

چونکہ بنی اسرائیل نے ایک مدت تک گائے کی پرستش کی تھی، مراد یہ تھی کہ گائے کو ذبح کرنے سے اس کی عظمت ختم ہو جائے، جس کے وہ ماضی میں معتقد تھے اور گائے کے پرستش کے قابل ہونے کی صلاحیت ختم ہو جائے، ہٹ دھرم اور خود خواہ افراد غالباً باتونی اور زیادہ سوال کرنے والے ہوتے ہیں، اور ہر چیز کے مقابلے میں بہانہ تراشی کرتے ہیں۔

آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ خداوند متعال کے بارے میں مکمل معرفت رکھتے تھے اور نہ حضرت موسیٰؑ کی حیثیت کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتے تھے، لہٰذا انہوں نے ان تمام سوالات کے بعد کہا: اب آپ نے حق بات کی ہے گویا جو کچھ اس سے قبل کہا گیا تھا وہ باطل تھا۔

بہر حال، جس قدر انہوں نے سوالات کئے، خداوند متعال نے بھی ان کی تکلیف کو سخت تر کیا، کیونکہ اس قسم کے افراد، اسی قسم کی سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔

دوسری طرف، ان خصوصیات والی گائے کا مالک ایک نیک شخص تھا اور وہ اپنے باپ کا کافی احترام کرتا تھا، ایک دن جب اس کا باپ سویا ہوا تھا اس کے لئے ایک فائدہ مند معاملہ پیش آیا، لیکن اس نے اپنے باپ کے نیند کی حالت میں ہونے کی وجہ سے اس تجارت سے صرف نظر کیا۔

خداوند متعال نے اس جوان کے اس برتاؤ کے بدلے میں اس کے لئے ایک دوسرا فائدہ بخش معاملہ فراہم کیا۔

تفصیلی جوابات

سوال کا جواب دینے سے پہلے، کچھ نکات بیان کرنا ضروری ہیں:

ا۔ چونکہ خداوند متعال حکیم ہے اور بنیادی طور پر حکیم و دانا شخص سے کوئی بیہودہ کام انجام نہیں پاتا ہے، اس لحاظ سے شیعوں کا اعتقاد ہے کہ صاحب شریعت سے صادر ہوئے

تمام احکام و افعال مصلحتوں اور مقاصد کے تابع ہوتے ہیں،اس سلسلہ میں آپ ہماری اسی سائٹ کے عنوان: منابع بیان حکمت احکام ومخلوقات سوال: ۲۶۰۸ (سائٹ: ۲۷۴۸) کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

اس بنا پر، قطعا اس امر میں بھی کوئی حکمت مضمر ہے، اگر چہ انسان اس سے نا واقف ہیں۔

۲۔آیات وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر زیادہ سوالات (غیر مربوط سوالات) کرنا پسندیدہ کام نہیں ہے، ممکن ہے اس کام کی کوئی سزا بھی ہو۔

راوی (احمد بن محمد) کہتا ہے: حضرت امام رضاؑ نے میرے نام تحریر فرمایا: تم کیوں زیادہ سوال کرتے ہو؟ اور زیادہ سوال کرنے سے پرہیز نہیں کرتے ہو؟ تم سے پہلے ایک گروہ کے افراد زیادہ سوال کرنے کی وجہ سے ہلاک اور نابود ہوئے ہیں۔ خداوند متعال نے بھی ارشاد فرمایا ہے: یا ایھا الذین آمنوا لاتسئلوا عن اشیاء[1]

۳۔بنی اسرائیل کے مقتول کو زندہ کرنے کے لئے پہلے حضرت موسیٰؑ نے صرف گائے کا تقاضا کیا تھا، لیکن بنی اسرائیل کی طرف سے اس مسئلہ کو سنجیدہ تلقی نہ کرنے اور بہانہ تراشی کرنے اور پے در پے اور بے جا سوالات کرنے کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ اس مشخص گائے کو لانے کے لئے مامور ہوئے۔[2] گائے کو ذبح کرنے اور مقتول لڑکی کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئی آیات کے ذیل میں بہت سے سوالات ابھرے ہیں، کہ ان میں سے بعض کو اس سوال میں پیش کیا گیا ہے اور بعض کو پیش نہیں کیا گیا ہے، ہم خلاصہ کے طور پر لیکن جامع صورت میں ان کو پیش کرتے ہیں:

۱۔خدا وند متعال نے حیوانات میں سے صرف گائے کو ذبح کرنے کے لئے بنی اسرائیل کو مامور کیوں کیا اور اس سلسلہ میں گائے میں کون سی خصوصیت تھی؟

چونکہ بنی اسرائیل سالہا سال تک مصریوں کے تسلط میں تھے، ہر دوسری محکوم اور بے بس قوم کے مانند خواہ نخواہ مصریوں کی توہم پرستی اور اعتقادات ان پر مسلط ہو چکے تھے۔

مصریوں کے مقدسات میں سے ایک گائے تھی۔ گویا ہندوستان کے مانند مصریوں میں گائے کا احترام اور تقدس زیادہ تر زمینداروں اور مال مویشی پالنے والوں میں تھا۔ چونکہ بنی اسرائیل ملک کے اس اکثریتی طبقہ کے ساتھ میل جول رکھتے تھے، اس لئے گائے کے تقدس اور پرستش نے ان پر ایسا اثر ڈالا تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی یکتا پرستی کو بھول گئے تھے، اور چونکہ گائے پرستی ان ہی طبقات میں رائج تھی، اس لئے تاریخ میں یہ عقیدہ مصر کے حاکم طبقہ کے خداوئں کے برابر شہرت حاصل نہ کرسکا۔ شائد بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور بیابانوں میں گائے پرست قبائل کے ساتھ لمبی مدت تک معاشرت کرنے کی وجہ سے گائے پرستی ان میں بھی رائج ہوچکی تھی۔ جس طرح بھی ہو، گائے اور گوسالہ پرستی ان میں سرایت ہوچکی تھی اور گائے اور گوسالہ پرستی کی محبت ان کے دلوں میں رچ بس چکی تھی۔ چنانچہ اسی سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۸۸ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: اور ان کے دل، گوسالہ کی محبت کے ساتھ آمیختہ ہوئے ہیں۔ اس بنا پر حضرت موسی (ع) کے چند دن غائب ہونے کی وجہ سے ان کی گوسالہ پرستی ان کی غفلت کی وجہ سے اور ناگہانی نہیں تھی بلکہ اس کا سرچشمہ اس پرستش کے ساتھ ان کی دلچسپی اور باطنی رجحان تھا۔ بنی اسرائیل میں خالص توحید کو سمجھنے کا شعور نہیں تھا، اس لئے ان کے لئے ضروری تھا کہ اپنے لئے ایک محدود و محسوس معبود کا انتخاب کریں۔

چونکہ غیر خدا کو پرستش کی حد تک مقدس ماننا اور ان سے محبت کرنا، خدا پرستی کے فطری شعور کو مسلسل چھپاتا ہے، اس لئے انسان کے شعور و ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے انبیاءؑ کا پہلا اقدام، بتوں اور طاغوتوں کے ساتھ منطقی و عملی مبارزہ کرنا اور ان رکاوٹوں کو انسانی عقل

کی راہ سے ہٹانا تھا۔

اس حقیقت کے پیش نظر، یہودیوں کو اجتماعی طور پر گائے کشی اور گائے کشی کا جشن (یا عید خون) منانے کا براہ راست حکم دیا گیا تھا، کہ سب لوگوں کو ایک گائے کا انتخاب کرنا چاہیئے اور اس کی خرید اور اس کو ذبح کرنے میں شریک ہو جائیں ۔ یہ گائے کشی، قربانی یا قصابی کے لئے نہیں تھی، بلکہ اس لئے تھی کہ اس عمل سے، ان کے ذہنوں سے گائے کا تقدس مٹا دیا جائے اور اس اجتماعی عمل کا اثر ان کے بڑوں اور چھوٹوں کے ذہنوں میں باقی رہے۔ عظیم پیغمبروں کا یہی طریقہ کار تھا اور یہ اصلاح اور نفوس کو احیا کرنے کا شیوہ تھا اس لحاظ سے حضرت موسیٰؑ نے سامری کے توسط سے بنائے گئے سونے کے گوسالہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے نذر آتش کر دیا اور اس کی راکھ کو پانی اور ہوا میں بکھیر دیا۔لیکن اس گوسالہ کی تصویر ان کے ذہنوں میں ہمیشہ زندہ تھی اور ان کے دلوں میں اس کی محبت باقی تھی اور ان کے اعمال و افعال میں اس گوسالہ کی پرستش کے آثار نمایاں تھے۔

قتل کے حادثہ نے تمام بنی اسرائیل کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور انہوں نے شور مچایا تھا، اس حادثہ نے گویا حضرت موسیٰؑ کے لئے ایک موقع فراہم کر دیا کہ یہ حکم صادر کریں، اگر چہ یہودیوں کو اس پر عمل کرنا بہت سخت گزرا تھا، اسی لئے اس کے بارے میں گونا گوں اعتراضات اور سوالات کرتے تھے کہ شائد اس حکم کو روکا جائے۔[3]

اس بنا پر، چونکہ بنی اسرائیل نے ایک مدت تک گائے پرستی کی تھی، مقصد یہ تھا کہ گائے کو ذبح کرنے سے اس کی عظمت ختم ہو جائے، جس کے وہ ماضی میں معتقد تھے اور گائے کی پرستش کے قابل ہونے کی صلاحیت ختم ہو جائے۔[4]

۲۔خداوند متعال نے کیوں ایک دوسرے جاندار کو قتل کر کے مقتول کو دوبارہ زندہ کیا؟

بنیادی طور پر خداوند متعال کی بے انتہا قدرت کی بارگاہ میں ایسے مسائل میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر خداوند متعال کا ارادہ کسی چیز کو پیدا کرنے کے سلسلہ میں اس چیز سے تعلق پیدا کرے تو وہ چیز پیدا ہوتی ہے،[5] لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ احکام الٰہی مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں، اس لحاظ سے بعض افراد نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ: خداوند متعال اپنی مکمل قدرت کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کے لئے کسی چیز کی پیدائش کو اس کی ضد کی راہ سے ظاہر کرتا ہے۔[6]

۳۔اگر یہ گائے زرد نہ ہوتی، لاغر اور بوڑھی ہوتی، تو کیا خدا کی قدرت کو کوئی نقصان پہنچتا؟

بیشک سوال مشکلات کو حل کرنے کی کلید اور جہالت و نادانی کو دور کرنے کا سبب ہوتا ہے۔لیکن ہر چیز کے مانند اگر سوال بھی اپنے معیار اور حد سے تجاوز کرے یا بیہودہ ہو، تو گمراہی اور نقصان کا سبب بن جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اس واقعے میں اس کی مثال کا مشاہدہ کیا۔

بنی اسرائیل گائے کو ذبح کرنے پر مامور تھے، بیشک اگر اس گائے کے لئے کوئی قید و شرط ہوتی تو اس کو بیان کرنے میں ہرگز تاخیر نہ ہوتی اور خدائے حکیم اسی لمحہ، جب انہیں حکم دیا تھا، اسے بھی بیان فرماتا۔ اس بنا پر اس سلسلہ میں قید و شرط رکھنا ان کا فریضہ نہیں تھا، اسی لئے لفظ بقرہ یہاں پر اسم نکرہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

لیکن بنی اسرائیل نے اس مسلم اصول کی پرواہ کئے بغیر، گونا گوں سوالات کرنا شروع کئے، شاید اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ حقیقت سے پردہ نہ اٹھایا جائے اور قاتل معلوم نہ ہوجائے، اور بنی اسرائیل میں یہ اختلافات جاری رہیں، جملہ فذبحوہا وما کادوا یفعلون[7] ان ہی معنی کی طرف ایک اشارہ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: انہوں نے گائے کو ذبح کیا لیکن

وہ اس کام کو انجام دینا نہیں چاہتے تھے؛۔

اسی واقعے کی آیت نمبر ۲۷ کے ذیل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ان میں سے ایک گروہ کے لوگ قاتل کو پہچانتے تھے، اور اصل قضیہ سے آگاہ تھے، اور شاید یہ قتل ان کی سابقہ سازش کے تحت انجام پایا تھا، لیکن وہ اس سے انکار کرتے تھے، کیونکہ اسی آیہ شریفہ کے ذیل میں ہم پڑھتے ہیں کہ: واللہ مخرج ما کنتم تکتمون[8] جس چیز کو تم لوگ پنہاں کرتے ہو، خداوند متعال اسے آشکار کرتا ہے۔

اس کے علاوہ ہٹ دھرم اور خود خواہ افراد غالباً باتونی اور زیادہ سوال کرنے والے ہوتے ہیں اور ہر چیز کے سلسلہ میں بہانہ تراشی کرتے ہیں۔

آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ نہ خدا کے بارے میں مکمل معرفت رکھتے تھے اور نہ حضرت موسیٰؑ کی حیثیت کے بارے میں آگاہ تھے، لہٰذا، انہوں نے ان تمام سوالات کے بعد کہا: الآن جئت بالحق[9]، اب آپ نے حق بات کہی ہے؛ گویا جو کچھ اس سے پہلے کہا گیا تھا، وہ سب باطل تھا۔

بہرحال، جس قدر انہوں نے سوال کیے، خداوند متعال نے بھی ان کی تکلیف کو سخت تر کیا، کیونکہ اس قسم کے افراد اسی سزا کے مستحق تھے۔[10] چنانچہ ہم روایتوں میں پڑھتے ہیں کہ خداوند متعال کے منشاء میں ہر مورد پر خاموشی اختیار کرنی چاہئے اور چون و چرا نہیں کرنا چاھیئے، کیونکہ بے شک اس میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت تھی[11]، لہٰذا حضرت امام علی بن موسی الرضاؑ کی ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ اگر وہ (بنی اسرائیل) ابتدا میں ہی ایک گائے کو منتخب کر کے ذبح کرتے تو کافی تھا، ولکن شدوا فشدد اللہ علیہم لیکن انہوں نے سخت گیری کی اور خداوند متعال نے بھی سختی سے کام لیا۔[12]

۴۔ یہ سب اوصاف کس لئے تھے؟

مفسرین نے یہاں پر یاد دہانی کرائی ہے کہ یہ گائے اس علاقہ میں بے مثال تھی اور بنی اسرائیل نے اسے گراں قیمت پر خریدا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس گائے کا مالک ایک نیک انسان تھا اور وہ اپنے باپ کا کافی احترام کرتا تھا، ایک دن اس کا باپ سویا ہوا تھا، اس کے لئے ایک سودمند معاملہ فراہم ہوا، لیکن اس نے صندوق کی چابی لینے کے لئے اپنے باپ کو نیند سے بیدار نہ کیا تاکہ اسے تکلیف نہ ہو، نتیجہ کے طور پر اس منافع بخش معاملہ سے صرف نظر کیا۔

بعض مفسرین کے بقول بیچنے والا اس چیز کو ستر ہزار میں بیچنے پر آمادہ تھا، اس شرط پر کہ اسے نقد قیمت دی جائے، اور نقد پیسے دینے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے باپ کو نیند سے بیدار کر کے صندوق کی چابی اس سے لے لے، لیکن اس جوان نے کہا کہ اسے اسی (۸۰) ہزار میں خریدے گا، لیکن پیسے اس وقت دے گا جب اس کا باپ نیند سے بیدار ہو جائے گا، آخرکار یہ معاملہ انجام نہیں پایا۔

خداوند متعال نے اس جوان کے معاملہ کی تلافی کے طور پر، اس کے لئے ایک دوسرا منافع بخش معاملہ فراہم کیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ: نیند سے بیدار ہونے کے بعد باپ اس قضیہ کے بارے میں جب آگاہ ہوا تو اپنے بیٹے کے اس عمل کے بدلے میں وہ گائے اسے بخش دی اور سرانجام اسے کافی نفع ملا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: انظروا الی البر ما بلغ باھلہ نیکی کو دیکھو کہ نیکوکار کے ساتھ کیا برتاؤ کرتی ہے۔[13]

حواشی

[1] عطاردی، عزیز اللہ، مسند الامام الرضاؑ، ج1، ص 352 (ترجمہ عزیز اللہ عطاردی، اخبار و آثار

حضرت امام رضاؑ) ناشر: آستان قدس (کانفرنس)، چاپ مشہد، 1406 ه، طبع اول.

[2] محدث نوری، مستدرک الوسائل، ج 15، ص 212، طبع مؤسسۃ آل البیت قم، 1408 ه.

[3] طالقانی، سید محمود، پرتوی از قرآن (با تلخیص)، ج 1، ص 191 - 194، شرکت سهامی انتشار، تهران، 1362 ه ش، طبع چهارم.

[4] طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج 1، ص 267، با استفادہ از ترجمۃ آن، ج 1، ص 211، ناشر: انتشارات ناصر خسرو، تهران، 1372 ه ش، طبع سوم.

[6] اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـًٔـا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ﴿۸۲﴾

[6] طبرسی، فضل بن حسن، ترجمہ مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج 1، ص 212 - 214.

[7] بقرہ، 71.

[8] قرہ، 72.

[9] بقرہ، 71.

[10] بقرہ، 71.

[11] امیر المومنین حضرت علیؑ نے لوگوں میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: بیشک خداوند متعال نے حدود کو مقرر فرمایا ہے اور اس سے تجاوز نہ کرنا اور کچھ اعمال کو واجب قرار دیا ہے انہیں ناقص اور نامکمل نہیں چھوڑنا اور بعض امور کو حکم کے بغیر چھوڑا ہے اور وہ فراموشی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مصلحت کی بناء پر ہے، پس تم لوگ ان امور کے بارے میں اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالنا اور اسے خدا وند متعال نے اپنی رحمت و مہربانی سے تمہارے لئے حکم کے بغیر چھوڑا ہے پس اس کی رحمت کو اپنی آغوش میں لے لو۔ من لا یحضرہ الفقیہ، ج ۴، ص ۷۵

[12] شیخ صدوق، عیوءاٴ خبار الرضاؑ ج 2، ص 13، نشر جهان، تهران، 1378 ه، طبع اول.

[13] عیون اٴخبار الرضاؑ، ج 2، ص: 14؛ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونه، ج 1، ص 310.